قیمت : ۸ روپے

AUSTRALIA	A$ 4.50	DENMARK	D.KR. 1700	ITALY	LIT. 4000	NEW ZEALAND	NZ$ 5.00	SRILANKA	Rs. 50
BANGLADESH	Taka 25	FRANCE	Fr 13	JAPAN		NORWAY	N.Kr 15.00	SWEDEN	Kr 20
BELGIUM	Fr 90	FINLAND	F.MK 13.00	KOREA	W 2.200	PAKISTAN	Rs. 20	SWITZERLAND	Fr 4
BRUNEI	B$ 5.50	GERMANY	DM 4.50	MALAYSIA	RM 4.00	PHILIPPINES	P 30	THAILAND	B 50
CANADA	C$ 4.50	HONG KONG	HK$ 19.00	MALDIVES	Rf 15.00	SAUDI ARABIA	SR 4	U.K.	£ 2.00
CHINA	RMB 16.00	INDONESIA	RP 4.500 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 4.30	SINGAPORE	S$ 3.50	U.S.A	US $ 3.50

بالآخر وہ عظیم لمحہ آپہونچا جس کا ۲۵ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو شدت سے انتظار تھا

- امت اسلامیہ کی سیاسی صف بندی کے لئے
- رسول اکرمؐ کے منجمد سیاسی ایجنڈے کو متحرک کرنے کے لئے اور
- ملک گیر مسلم سیاسی پارٹی کی تشکیل کی منصوبہ بندی کے لئے

ملک بھر سے غیور اور باحوصلہ مسلمانوں کے وفود

مسلم سیاسی پارٹی کے پہلے

ورکشاپ

میں شرکت کے لئے دہلی پہونچ رہے ہیں جہاں تین روزہ اجلاس میں شرکت کے ذریعے وہ نئی مسلم فکر کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور یہیں مسلم سیاست کے مستقبل کا پروگرام بھی ترتیب پائے گا۔

تاریخ کے اس نازک لمحے میں جب ہندوستانی مسلمان ایک نئے سیاسی رویے کی بنیاد رکھنے والے ہیں آپ کی موجودگی ایک اعزاز ہے بشرطیکہ اس تاریخ ساز عمل میں آپ بھی شریک ہوں۔

نشستیں مخصوص ہیں لیکن آپ بھی اپنی درخواست بھیج سکتے ہیں۔ البتہ شرکت کے لئے ضروری ہے کہ ہم نے آپ کے لئے سیٹ بک کرلی ہو۔ وقت کم ہے فون، فاکس اور ای میل پر رابطہ کیجئے۔

پہلا ورکشاپ بمقام دہلی بتاریخ ۲۶/ ۲۷ اور ۲۸/ جنوری ۱۹۹۹ء

Phone : (011) 6827018, 6926246
Fax : (011) 6946686
E-mail : militime@del3.vsnl.net.in
or : millitimes@hotmail.com.

الداعی
راشد شاز

بہنوں کے لئے بھی شرکت کا نظم ہے۔ اہل خیر سے مالی تعاون کی اپیل ہے۔

جنوری ۱۹۹۹ء
قیمت: آٹھ روپے
سالانہ زر تعاون: ۱۰۰ روپے
بیرون ممالک سے: ۲۵ امریکی ڈالر
سالانہ زر تعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں
ڈرافٹ پر صرف اتنا لکھیں
Milli Times International New Delhi

اس شمارے میں

یکے از مطبوعات مسلم میڈیا ٹرسٹ
ایڈیٹر محمد احمد سعید

ملی ٹائمز انٹر نیشنل
ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵
فون: ۶۸۲۷۰۱۸، ۶۹۲۶۲۳۶
فاکس: ۶۹۳۶۶۸۶ (۱۱)
E-mail: militime@del3.vsnl.net.in

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ ملی ٹائمز کی انقلابی دعوت کی اس امت کو سخت ضرورت ہے بالخصوص ایسے ماحول میں جب کسی اور جانب سے منجمد اسلامی ایجنڈے کو دوبارہ متحرک کرنے کی آرزو کا اظہار بھی نہ ہو رہا ہو۔ کوئی شمارہ تاخیر سے شائع ہو یا چھپنے سے رہ جائے تو قارئین کی ٹیلی فون کالوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ شکایت اور اندیشوں کے خطوط کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ ہر جانب سے اس اندیشے کا اظہار ہوتا ہے کہ اس رسالے پر جتنی بھی پریشانی آئے اسے جاری ضرور رہنا چاہیے۔

ملی ٹائمز اب اشاعت کے چھٹے سال میں داخل ہو رہا ہے۔ اب تک انقلابی اقدام کے آغاز کے بارے میں ان صفحات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ نئی مسلم سیاست کے نظری اور عملی پہلوؤں پر بھی ہم نے خاطر خواہ بحث کی ہے۔ الحمد للہ کہ اب ان باتوں کی صداقت پر ایمان لانے والوں کی کمی نہیں۔ بہت سی چھوٹی بڑی تحریکیں ان خیالات سے حوصلہ پا کر وجود میں آئی ہیں اور یقیناً بہت سے لوگ جو اس ملک میں تبدیلی کے خیال سے مایوس تھے انھیں دوبارہ متحرک ہونے کا حوصلہ ملا ہے۔ البتہ ہمارے دانشور قارئین کا ایک بڑا حلقہ اب بھی صرف بہت خوب اور سبحان اللہ کی صدا لگا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض لوگ ہماری چیزوں کو صرف دماغی ورزش اور دانشوری میں اضافے کے لئے پڑھتے ہیں۔ پڑھے لکھے مسلمانوں میں ایک بڑا حلقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو چلا ہے جو انقلابی لٹریچر کو بھی تفریحی ادب کے طور پر پڑھتا ہے۔ طویل گفتگو میں چاق و چوبند، عالمانہ مباحث کے لئے ہر دم تیار انھیں اس بات کا احساس تو ہے کہ امت کے مستقبل کا راستہ ملی ٹائمز کے صفحات سے ہو کر گزرتا ہے اور اس نقطہ نظر کی حمایت میں ان کے پاس دلائل کی کمی بھی نہیں۔ لیکن عجب سانحہ یہ ہے کہ وہ خود اس راہ میں آگے بڑھنا نہیں چاہتے، کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

جس شخص کو دنیا کا جتنا زیادہ علم ہے، دانشوری جس کے حصے میں جتنی زیادہ آئی ہے وہ اتنا ہی بڑا بزدل ہو گیا ہے۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے حساب کتاب کی ارتھمیٹک میں کچھ اس طرح اعداد و شمار ترتیب دیتا ہے کہ نتیجہ صفر کے علاوہ کچھ اور بر آمد نہیں ہوتا۔ خالی خولی صفر آگے پیچھے کچھ نہیں، مکمل نقصان۔ حالانکہ وہی شخص اپنی ذاتی زندگی میں رزق کی تلاش اور مناصب کی دوڑ دھوپ میں بڑے بڑے خطرات مول لیتا ہے لیکن آخرت کی بہتری کے لئے اور رسول اکرم کی امت کو موجودہ نظام جبر سے نجات دلانے کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ یہ دین سے وابستگان کا عجیب و غریب حلقہ ہے، جو دین کے مطالب سے جان بوجھ کر دامن بچاتا ہے۔

گورکھپور میں ہمارے ایک رفیق ہیں حافظ محفوظ صاحب، پچھلے دنوں انھوں نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی اور سے تو ہم یہ توقع نہیں کرتے لیکن اگر مسلمانوں کا دانشور طبقہ کتاب و سنت کی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ، جن تک ملی ٹائمز پہنچتا رہا ہے وہ بھی اگر اس دعوت کی حمایت میں فوری طور پر اٹھ کھڑے نہیں ہوتے تو میں سمجھتا ہوں کہ انھیں آخرت کے وقوع ہونے میں شبہ ہے۔ جب لوگ دنیا کی چھوٹی چھوٹی منفعت کے لئے اپنا سکون قربان کر سکتے ہیں، پریشانیاں مول لے سکتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی کے حصول کے لئے انھوں نے تعطل کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ ان کے اس خیال کو شدت احساس کا نام دیں البتہ اتنی بات تو ضرور ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ نہ جانے کس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ موت جیسی اٹل حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ ہم جس طرف انھیں لے جانا چاہتے ہیں وہ اس موت موت زندگی سے نجات کا راستہ ہے۔ ایک ایسی زندگی جسے دنیا میں بھی زندگی کہا جا سکے اور جس کے خاتمے پر بھی موت کا گمان نہ ہو۔ ہماری دعوت بنیادی طور پر موت پر فتح کی دعوت ہے۔ ایک ایسی کامیاب زندگی جینے کی سعی جس کے خاتمے پر ہماری قبروں پر تاریخ وفات کے بجائے تاریخ پیدائش لکھی جا سکے کہ مومن کے لئے اصل زندگی، دائمی اور مسلسل زندگی، تو اس مختصر زندگی کے خاتمے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اے کاش کہ ہمارے "دانشور" قارئین بھی اس حقیقت کو سمجھ سکیں۔

(ادارہ)

پردے کی حمایت میں

"پردہ مگر کس حد تک" تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ میں مضمون کے مندرجات سے پوری طرح اتفاق رکھتا ہوں۔ بلکہ کافی عرصہ سے انھیں خطوط پر لکھنے کی سوچ رہا تھا۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اب تک یہ کام انجام نہ پاسکا۔ ضرورت ہے کہ موجودہ تحریر کو مختلف طریقوں اور مختلف زبانوں کے ذریعے عام کیا جائے تاکہ اللہ کی بندیوں کو انسان کے وضع کردہ ملفوف سے اللہ کے وضع کردہ ساتر پردے کی طرف واپس لایا جاسکے اور وہ امت مسلمہ کی جدوجہد میں دوبارہ پوری طرح شریک ہوسکیں۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ایڈیٹر مسلم اینڈ عرب پرسپکٹیوز۔ نئی دہلی

زبان آسان استعمال کریں

نومبر ۱۹۹۸ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ خاص طور پر مضمون "پردہ مگر کس حد تک؟" قابل تعریف ہے۔ کہیں کہیں مضمون محض طویل کرنے کے خاطر بے وجہ بحث کی گئی ہے اور جہاں تفصیل سے بحث کی ضرورت تھی مثلاً "اگر کسی ہنگامی صورت حال میں محاذ جہاد پر مردوں کی قوت ناکافی ہوگئی ہو یا اسلامی معاشرے کو دشمنوں کی زد سے بچائے رکھنا صرف مردوں کے بس کی بات نہ ہو تو ایسی صورت میں مسلم خواتین پر اضافی ذمے داری عاید ہوجائے گی" اس پر نہایت اختصار سے کام لیا گیا۔ جہاں ہر بات طوالت کی حد تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے تو وہاں اس اہم موضوع پر بھی روشنی ڈالنا چاہیے۔

آیات قرآنی اور تفاسیر کا ترجمہ لکھنا نہایت ضروری ہے۔ میں اور دیگر قارئین امید کرتے ہیں کہ یہ رسالہ عوام کے لئے بھی ہے صرف علمائے کرام کے لئے نہیں۔ خدا کے واسطے زبان سلیس اور واضح لکھا کریں۔ پروف ریڈنگ ضرور کرلیا کریں۔

جہاں تک دوسرے مضمون "کیا حصول علم کے لئے پردہ ترک کرنا جائز ہے" کا سوال ہے، یہ مضمون انتہائی Confusing ہے۔ اگر اہل شریعت حضرات کے بجائے قرآن واحادیث کے حوالے ہوتے تو یہ مضمون جامع ہوتا۔ یہ تمام حضرات اہل علم اور اہل شریعت تو ہیں مگر لگتا ہے کہ اہل دنیا نہیں جس میں یہ رہتے ہیں اور اسی میں ساری زندگی گزاری ہے اور شاید دیکھتے بھی ہوں گے۔

عثمان خالد قریشی۔ دلشاد کالونی، دہلی

غیر شرعی کوشش

نومبر ۱۹۹۸ء کا "ملی ٹائمز" نظر سے گزرا جس کا صفحہ اول (ٹائٹل) خواتین کے فوٹوؤں سے بھرا ہوا ہے اور پھر اوپر ہی جلی ہیڈنگ میں لکھ دیا ہے کہ عورت کا پردہ کس حد تک؟ اسی عنوان کے تحت اندر تفصیلی مضمون بھی پڑھا جس میں آپ نے قرآنی آیات اور احادیث مقدسہ کی تشریحات وتاویلات بیان کرکے عورتوں کے چہروں سے پردہ ہٹانے کی غیر شرعی کوشش کی ہے۔ یہ داعیہ آپ کو کیوں پیدا ہوا؟ آج کے انحطاطی دور میں اگر عورت چہرہ کا پردہ کرلیتی ہے اور کرنا بھی چاہئے تو اس میں قباحت کیا ہے؟

محترم رسالہ چلانے کے لئے اور بہت سے موضوعات ہیں اس فکر کو چھوڑ دیجئے کہ عورت چہرہ کیوں ڈھکے؟ آج کے معاشرے میں تو بغیر آپ کے بھاؤ کے ہی عورت گلی سے باہر نکل کر چہرہ کھول لیتی ہے اور دوکان و دفتر میں جاکر تو برقع بھی ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ آخر اس عنوان پر آپ کو لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اجتہاد کا حق علماء کو ہے کسی اخبار نویس یا رسالہ کی بکری کرنے والے کو نہیں۔

عبدالرحیم۔ بڈیڈوی

کیا قرآن غلطی پر ہے؟

جس کا ڈر تھا آخر وہی ہوا۔۔۔ جب قرآن ہم سے کہتا ہے کہ مومنوں پر کافروں کو نگہبان نہیں بنایا گیا ولن یجعل الله للكافرين على المومنين سبيلا تو نعوذ باللہ یہ سوچ ہمیں یہاں تک لے جاتی ہے کہ شاید قرآن ہی غلط کہتا ہو۔ ہاں، اگر ہم نے قرآن پر اعتبار کیا ہوگا تو کم سے کم اس کی بات کو تسلیم کرکے کسی کافر کی بات پر بھروسہ نہ کرتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی جو درگت بن رہی ہے وہ شاید قرآن پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ ہی سے ہو۔ ہم نے اپنا امام اور رہنما کافروں کو بنالیا۔ ہم اسلام کے راستے پر نہ چل سکے مگر ملائم سنگھ یادو، لالو پرساد یادو، سونیا گاندھی، اندر کمار گجرال، جیوتی باسو کے اشاروں پر ناچتے رہے۔ اسلام کے لیے تو نہیں مگر پولنگ بوتھوں پر ان کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے جس کی سزا ہمیں دیر یا سویر فسادات کی شکل میں ملتی رہی۔

اگست ۱۹۹۸ء کے شمارے میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ملک گیر مسلم سیاسی پارٹی کے لیے ملک بھر کے ہزاروں مسلمان بھائی بہنوں نے اپنا کاندھا فراہم کردیا ہے۔ اس بامقصد مہم میں ہم بھی شامل ہونا چاہتے ہیں۔ عرض گذارش یہ ہے کہ آپ ہمیں ملی پارلیامنٹ کے تعلق سے معلومات دیں۔ اس کا نصب العین، طریقہ کار کیا ہے؟ کیوں کہ بہت سی ملک گیر سیاسی پارٹیوں کا وجود ہندوستان میں ہے جو صرف اور صرف نام کی مسلم پارٹیاں ہیں۔ اس لیے ہم نصب العین اور طریقہ کار معلوم کرکے ان نامعلوم بھائی بہنوں کے ساتھ کاندھے میں کاندھا ملاکر چل سکیں۔ اللہ کے دربار میں جب ہم حاضر ہوں تو ہمیں کوئی شرمندگی نہ ہو۔

ریاض احمد محمد شفیع۔ مالیگاؤں محمد زاہد عبدالمجید۔ مالیگاؤں

کارواں جاری رہے

آج مسلم ملت جس بے حسی، انتشار، نااتفاقی اور محرومی کا شکار ہے اس کی ذمہ دار جہاں نظام کفر کی منصوبہ بندی، سازش اور دہشت گردی ہے وہیں ہمارے دینی علماء اور مسلم سیاسی لیڈران (کسی بھی پارٹی سے وابستہ) بھی ہیں جو ایمان اور دین بیچ کر ہر کسی سیاسی پارٹی کو استحکام بخشتے رہے اور اپنی ملت کے لئے سوائے رسوائی اور محرومی کے کچھ نہ دے سکے۔ آج مسلمانوں کے لئے ایک مسلم پارٹی کے قیام کی سخت ضرورت ہے اس لیے پہلے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنا خود احتساب کرے کہ وہ دین کی یا قوم کی اور خود کی کتنی خدمت کرتا ہے۔ صرف داڑھی رکھ لینا اور نماز پڑھ لینے سے ہی کوئی مسلمان نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ایمان مکمل ہونا چاہئے۔

آپ اپنا کارواں جاری رکھئے انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔ ہمیں کسی سے خوفزدہ ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان اگر اتنا جان لے کہ مسلمان کا محافظ صرف اللہ ہے تو وہ بھیک مانگنے کی عادت اور خوفزدہ و بے بس ہونے کی حالت سے نکل سکتا ہے۔ خدا قوم پر رحم فرمائے۔ (آمین)
نعیم الدین فریدی۔ بھلئی نگر (ایم پی)

علماء کے معتقدین سے

ملی ٹائمز میں اب تک میں نے کبھی ایسا مضمون نہیں پڑھا جس میں علماء کرام، صوفیاء عظام کو لعن وطعن کیا گیا ہو، البتہ نظام کفر کے حامیوں، غلاموں، زر خریدوں پر ضرور تنقید کی گئی ہے، کم ظرفوں کو ضرور لتاڑ گیا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کی نقاب کشائی کو علماء عظام سے بیزاری کا نام دیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ جون کے شمارے میں باجپئی کے لئے دعا کرتے ہوئے علماء کے فوٹو کس بات کی غمازی کرتے ہیں؟

ویسے میں بھی، ۱۹۴۷ء سے جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی تب سے اکابروں سے رابطہ رکھتا ہوں، میرے گھر شیخ الاسلام انور شاہ کاشمیری، مولانا حفظ الرحمن، حضرت منت اللہ رحمانی، قاری طیب ودیگر علماء کرام آتے رہے تھے۔ میرے ابا حضرت مولانا عبدالغفور مرحوم کے ساتھی، ہم عصر لوگ تھے۔ ان کی خدمت بھی کی، آزادی کی تحریک، مخالفت پاکستان کے نعرے بھی گائے تھے۔ ان حضرات میں آزادی، قوم وملت کی خدمت کا جو جذبہ پایا تھا آج کے ان سجادہ نشینوں، اماموں اور قوم کے ٹھیکیداروں میں یکدم نہیں پایا جاتا ہے۔

نیوکلیائی دھماکہ، ایودھیا میں رام مندر کی تیاری، ملک میں خطرناک تبدیلیوں کا آغاز، یہ سب کیا ہیں؟ کیا اب بھی اس قوم محمدی کی آنکھیں نہیں کھلتی ہیں؟ ضرورت ہے اس وقت قائد ملی کے دعوت پر لبیک کہنے کی، ان کے تھاؤ پر قوم وملت کو یکجا ہونے کی اور ایک پلیٹ فارم پر آکر جمع ہونے کی۔ اللہ رب العزت قائد ملی کے عزائم کو بلند رکھے اور ایسے کئی اور قائد کو پیدا کردے۔ آمین ثم آمین۔
عبداللہ ندیم، بڑی عیدگاہ۔ پورنیہ بہار

ہمارے لائق کوئی خدمت

آپ پر اللہ کی رحمت ہو۔ ملی ٹائمز کو اللہ محفوظ رکھے۔ یہاں سعودی عرب میں بھی یہ رسالہ کافی مقبول ہوتا جارہا ہے۔ اس کے حلقہ احباب میں توسیع ہوتی جارہی ہے۔ ہم سب لوگ اللہ تعالی کے بارگاہ میں دعاگو ہیں کہ وہ آپ لوگوں کو ہمت اور حوصلہ عطا کرے تاکہ جس کام کا بیڑا آپ نے اٹھایا ہے وہ انجام پائے۔

جس طرح سے آپ ہندوستانی مسلمانوں کے تلخ حقائق دنیا کے سامنے پیش کررہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی ایک ایسے طوفان کا شکار ہے جس کو ایک نڈر ملاح کی ضرورت ہے جو اس کو ڈوبنے سے پہلے خیروعافیت کے ساتھ کنارے پر لاسکے اور ایک ایسے قائد کی ضرورت ہے جو اخلاص اور سچے دل سے اس منتشر امت کو یکجا کرکے نظام کفر سے نجات دلائے۔ آج ہمارے درمیان سچی نیت اور اخلاص کا فقدان ہے جس وجہ سے آج ہم ایسے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں جس سے باہر نکلنا ناممکن لگ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری قیادت آج شیطانوں کے ہاتھ میں ہے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جو قوم اپنا کوئی امیر نہیں مقرر کرتی ان کا امیر شیطان بن جاتا ہے جو ان کو باطل کی رنگینیاں دکھا کر حق کے راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ حالت ہندوستانی مسلمانوں کی ہے۔ انشاء اللہ وطن واپس آنے کے بعد ہر ممکن آپ کی مدد کریں گے۔ یہاں قرب وجوار میں یہ رسالہ تمام ہندوستانی اردو داں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ سارے لوگ آپ کے اس اخلاص بھرے کام سے بہت متاثر ہیں اور مسلم سیاسی پارٹی کے قیام میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اگر ہم لوگوں کے لائق یہاں رہ کر کوئی کام ہو تو ضرور حکم فرمائیں۔
محمد ہارون خان۔ الجبیل سعودی عرب

جیسے منزل مل گئی

آپ کا ملی ٹائمز پہلی بار پڑھنے کو ملا۔ اپنے دل کی کیفیت کو الفاظ کی زبان نہیں دے سکتا۔ ایک عجیب سا سرور اور شادمانی کا احساس ہوا۔ ایک جستجو تھی گم نام منزل کی ملی ٹائمز کے مطالعہ سے منزل کی صحیح سمت کا تعین کرنا آسان ہوا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد کی قیادت کا قائل تھا مگر جغرافیائی حدود درمیان میں حائل ہے۔ اب وہی نظریات یعنی قرآن اور سنت کے حوالوں سے ایک جماعت ہمارے ملک میں وجود میں آرہی ہے اس بات کی مجھے بے انتہا خوشی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کنواں خود پیاسے کے پاس آگیا ہو اور یہ میری غفلت کا نتیجہ ہے کہ ملی ٹائمز جیسے انقلابی جریدے سے میری شناسائی بہت دیر سے ہوئی۔

اور میں اس بات کو خوش نصیبی سے تعبیر کرتا ہوں کہ اگست ۱۹۹۸ء کا شمارہ ملی ٹائمز پہلی بار مطالعہ کے لئے ملا جس میں اس بات کا اعلان پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مسلم سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی جائے گی۔ دنیا میں موجودہ سیاست کے اثرات ذہن پر کچھ اس طرح سے اثرانداز ہیں کہ سیاست گالی معلوم ہوتی ہے۔ براہ کرم آپ مسلم سیاسی جماعت کی وہ تخیلی تصویر سے بھی متعارف کرائیں جس کی پہلی اینٹ ہندوستانی موجودہ سیاست میں کس انداز سے رکھی جائے گی؟
جاوید حسن خاں، مکۃ المکرمۃ۔ سعودی عرب

ملی ٹائمز ہندی میں شائع کریں

میں اقبال فاروقی اے ایم یو کے ایک اسکول میں نویں کلاس کا طالب علم ہوں۔ میں نے ملی ٹائمز کو پچھلے دو مہینے سے ہی شروع کیا ہے۔ یہ میگزین مجھے بہت پسند ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے لئے بہت فائدہ مند ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کو دور دور تک پھیلایا جائے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کو ہندی میں بھی شائع کیا جائے کیونکہ آج بہت سے مسلمان اپنی مادری زبان ہونے کے باوجود اردو نہیں جانتے یا اگر جانتے ہیں تو بہت کم۔ ایسی بات بھی نہیں کہ اردو ماننے والے مسلمان ہی مسلمان کے فکرمند یا قوم کو چاہنے والے ہیں۔ اس لئے اس میگزین کو ہندی میں بھی شائع کیا جائے تاکہ اس کو کافی لوگ پڑھ کر اسلام کو اور موجودہ دور میں مسلمانوں کی حالت کو جان سکیں۔
اقبال فاروقی۔ علی گڑھ

آئندہ شمارے میں

گورکھپور میں قائد ملی کا خطاب 'سیرت' ملاحظہ فرمائیں

اسلام، مسلمان اور کانگریس

کانگریس کی باسی کڑاہی میں ایک بار پھر ابال کا سماں ہے۔ حالیہ اسمبلی انتخابات میں کانگریس کو جو کامیابی ملی ہے اس نے ایک بار پھر ملک کو اسی فرسودہ سیاست کی راہ دکھائی ہے جس کے نتیجے میں اس ملک کے مسلمانوں پر گذشتہ پچاس برسوں میں ہر روز ایک نیا جہنم طلوع ہوتا رہا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس باسی کڑاہی سے جو لوگ سب سے زیادہ کچھ پانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں ان میں مسلمان سب سے آگے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کانگریس کے سڑے مردے میں زندگی کے آثار سے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی حکومت قائم ہونے والی ہے۔ مسلمانوں میں ہر چھوٹا بڑا قائد عقل و دانش کے تابعدار اور خالی الدماغی کے علمبردار جسے بھی دیکھئے وہ کانگریس کے احیاء کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر مسلمانوں کے اہل دانش کو ہو کیا گیا ہے؟ جس کانگریس کے ہاتھوں انھیں پچاس برسوں میں مسلسل ہزیمت اٹھانی پڑی ہے اسی کانگریس کے احیاء کے لئے وہ دیدہ و دل فراش کرنے پر آخر اس قدر کیوں مچلے جاتے ہیں؟ کیا کانگریس نے کوئی ایسا وعدہ کیا ہے یا کانگریس کی نئی قیادت سے اس بات کا امکان پیدا ہو چلا ہے کہ اب اگر دوبارہ اسے اقتدار مل جائے گا تو وہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا کر دے گی یا یہ کہ مسلمان اب تک نظام اسلامی کے قیام کے جس فریضے کو اس ملک میں انجام دینے سے قاصر رہے ہیں اب یہ کام محترمہ سونیا گاندھی کے ہاتھوں انجام پانے والا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ جو لوگ مصالح امت کے دعویدار ہیں اور جن کے تابڑ توڑ بیانات کانگریس کی حمایت میں آتے رہے ہیں ان بھلے مانس لوگوں سے کانگریس کا کوئی ایسا خفیہ معاہدہ ہو گیا ہے یا ہماری یہ ساری خوش فہمی ہماری اپنی سادہ لوحی کی دین ہے۔ قرائن تو یہی بتاتے ہیں کہ کانگریس نظری اعتبار سے جہاں کل تھی وہیں آج بھی ہے۔ وہ اس ملک میں وہی کچھ کرنا چاہتی ہے جو گذشتہ ۴۵ سالہ دور اقتدار میں کرتی رہی ہے۔ البتہ اب اگر اسے دوبارہ اقتدار مل گیا تو اس بات کا پورا خیال رکھے گی کہ مسلمانوں میں نئے متبادل (option) کو آزمانے یا کسی نئے متبادل کو سامنے لانے کا کوئی خیال ہی پیدا نہ ہو تاکہ کانگریس کو مفت کے مسلمان خادمین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ آجائیں۔

مسلمانوں سے مفت کام لینے کا فن کانگریس کو خوب آتا ہے۔ کانگریس کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ اس کے رضاکاروں اور خادمین کی فہرست میں مسلمان پیش پیش رہے لیکن جب اقتدار کے ثمرات پارٹی کے ہاتھوں میں آئے تو اس میں مسلمانوں کو کچھ بھی نہ ملا۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی یہی کچھ ہوا ہے اور اس کے بعد بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کانگریس کے بحرانی دور میں جب پارٹی کو سخت جدوجہد کی ضرورت تھی، جب رضاکاروں سے قربانیاں درکار تھیں تو اس وقت ابوالکلام آزاد کو پارٹی کی صدارت پر متمکن کیا گیا۔ اس عمل سے عام مسلمانوں کو یہ تاثر ملا گویا کانگریس مسلمانوں کی جماعت ہے جس کی قیادت ایک عبقری عالم کے ہاتھوں میں ہے۔ عام سادہ لوح مسلمان ہی نہیں بلکہ بڑی بڑی روحانی شخصیتیں اور جمیعۃ العلماء کا پورا گروپ کانگریس کا دست و بازو بن گیا۔ اس دھوکے میں کہ مستقبل مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوگا مخلص مسلمانوں نے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں۔ ملک بھر میں اہل ثروت مسلمانوں نے اپنی کوٹھیاں اور قیمتی جائداد کانگریس کے دفاتر کے لئے پیش کر دیئے۔ نہ جانے کتنے دیندار مسلمانوں نے کانگریس کے قافلے کو آگے لے چلنے کے لئے اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کر دیا لیکن جب پارٹی ثمرات بٹورنے کے عہد میں داخل ہوئی تو ہر ممکن پیش بندی کر دی گئی کہ نئی تبدیلی سے فائدہ اٹھانے میں

آخری رسولؐ کے امتی جو اب سونیا گاندھی کی خدمت پر مامور ہیں

مسلمانوں کا کوئی رول نہ رہے لہٰذا ابوالکلام آزاد سے پارٹی کی صدارت واپس لے لی گئی تاکہ نئے ہندوستان کے خاکے کو حتمی شکل دینے میں آپ کا کوئی رول نہ رہے۔ آزاد کوئی عام سیاسی آدمی نہ تھے، انھیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا۔ اپنے کیریر کے بالکل ابتدائی مرحلے میں وہ حزب اللہ کے ذریعے ایک نئے انقلاب کا حوصلہ رکھتے تھے پھر یہ کہ آزاد کے ساتھ حوصلہ مند مسلمانوں کا ایک بڑا قافلہ کانگریس کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دے رہا تھا۔ جب اتنی بڑی قربانیوں کے بعد آزاد کو آنے والے دنوں میں مایوسی اور پشیمانی کے علاوہ کچھ نہ مل سکا تو بھلا آج کے خالی الدماغ بے شعور خادمین اپنے سینوں پر تمغۂ خدمت سجانے کے بجائے اور کیا پاسکتے ہیں؟

کانگریس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے جو لوگ ملک بھر میں سب سے زیادہ جوش وخروش دکھارہے ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ شمالی ہند کی دو کلیدی ریاستوں میں پارٹی نے یہ کام خاص طور پر مسلمانوں کو سونپ رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سے اترپردیش میں سلمان خورشید کو کانگریس کی ذمہ داری ملی ہے مسلمانوں میں کانگریس کی مقبولیت کا گراف بڑھا ہے۔ جو مسلمان کل تک ملائم سنگھ کی قیادت میں سماجی انصاف کا معرکہ سر کرنا چاہتے تھے اب وہ اپنے ہم مذہب سلمان خورشید کی صحبت میں زیادہ بے تکلفی محسوس کرتے ہیں۔ سلمان خورشید جیسے بھی مسلمان ہوں، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لہ جنڈے کے لئے کام کرتے ہوں یا نہیں، عام مسلمان انھیں کانگریسی کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی سمجھتا ہے۔ پھر یہ کہ اترپردیش میں مسلمانوں کے درمیان ان کی قرابت داری، چلت پھرت اور راہ ورسم بھی موجود ہے۔ اس لئے ان کے اس اسلامی رشتے سے تو یقیناً کانگریس کو فائدہ پہنچے گا۔ البتہ مسلمانوں کی جدوجہد اور ان کی قربانیوں سے جب کانگریس صوبے میں دوبارہ برسراقتدار آجائے گی تو انھیں یہ بتایا جائے گا غم نہ کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں، بس تمہارا کام ان شکایات کو غم وغصہ اور احتجاج کے ساتھ ہم تک پہنچاتے رہنا ہے۔

حالیہ اسمبلی انتخابات میں گو کہ بعض معتبر مسلمانوں نے کھلم کھلا کانگریس کی حمایت سے احتراز کیا البتہ ان کی بعض کاغذی تنظیموں کی طرف سے جو بیانات

مسلمانوں سے مفت کام لینے کا فن کانگریس کو خوب آتا ہے۔ کانگریس کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ اس کے رضاکاروں اور خادمین کی فہرست میں مسلمان پیش پیش رہے لیکن جب اقتدار کے ثمرات پارٹی کے ہاتھوں میں آئے تو اس میں مسلمانوں کو کچھ بھی نہ ملا۔

کانگریس ہو یا دوسری سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کی زبانی حمایت کا ان کے یہاں خاصا انتظام ہے۔ البتہ عملی طور پر یہ سب کے سب اسلام اور مسلمانوں کے درپے ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں اس کا بالکل الٹا کرتے ہیں۔

آئے اس میں یہ دلیل دی گئی کہ اب چونکہ کانگریس نے بابری مسجد کے سلسلے میں ندامت کا اظہار کردیا ہے اور یہ کہ کانگریس کی نئی تبدیل شدہ قیادت مسلمانوں کے سلسلے میں بہتر پروگرام رکھتی ہے۔ یہ بیانات چونکہ خود کانگریس کی انتخابی مہم کا حصہ تھے اس لئے اخبارات میں انھیں اس انداز سے پیش کیا گیا جیسے عام مسلمان کانگریس کو دوبارہ برسراقتدار لانے کے لئے اپنا تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہے، جس کا اظہار ان قائدین کے بیانات سے ہوتا ہے۔ اگر کانگریس کا احساس ندامت اسے مسلم ووٹ کا حقدار بناسکتا ہے تو پھر دوسری سیاسی پارٹیوں کا احساس شرمندگی ہمارے لئے قابل اعتناء کیوں نہیں؟ ہمیں نہیں معلوم کہ بیان دینے والے حضرات واقعی اتنے احمق اور معصوم ہیں یا وہ اپنی چھوٹی سی منفعت کے لئے امت کو بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ کانگریس نے بابری مسجد کے مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ شرمندگی کا اظہار کیا ہے لیکن یہ کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر لال قلعے کی فصیل سے سابق کانگریس صدر نرسمہاراؤ نے بابری مسجد کی تعمیر نو کی بات بھی کی تھی لیکن محض باتوں سے کب تک تسکین ہوسکتی ہے؟ اور اگر اظہار ندامت کو ہی کسوٹی بنالیا جائے تو کانگریس سے کہیں زیادہ ندامت بھارتیہ جنتا پارٹی کے اڈوانی جی کو ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ۶ دسمبر ان کے لئے ایک غمناک ترین دن تھا لیکن ایسا کہنے سے نہ تو اڈوانی جی کے نظریات میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی اور نہ ہی کانگریس مسلمانوں کے ساتھ مل کر بابری مسجد کی تعمیر کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ پھر ان خالی خولی بیانات سے وہی لوگ بہل سکتے ہیں جو بہلنے کے لئے بس کسی بہانے کی تلاش میں ہوں۔

ہمارے خیال میں کانگریس کی طرف مسلمانوں کی دوبارہ واپسی ایک احساس شکست کا اظہار ہے۔ گویا یہ بات کہی جارہی ہے کہ مسلمانوں نے دوسرے تمام متبادل کو آزمالیا، پٹے ڈگر سے ہٹ کر نئے راستوں کو بھی دیکھا لیکن تھک ہار کر تجربوں نے بتادیا کہ اگر مسلمانوں کو جائے امان مل سکتی ہے تو صرف کانگریس کے دامن میں۔ کانگریس کی طرف دوبارہ واپسی مسلمانوں کو وہ توقیر بھی عطا کرنے میں ناکام رہے گی جو پہلے کبھی انھیں حاصل تھی۔ کانگریس کی حیثیت پڑوس کے اس بنیے کی ہوگی جو یہ جان لینے کے بعد کہ آپ کو کوئی دوسرا ادھار دینے کے لئے تیار نہیں

ہے، آپ کے ہاتھوں خراب مال مہنگے داموں پر بیچتا ہے۔ اس لئے اگر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مستقبل کی کانگریس مسلمانوں کے تئیں زیادہ مائل بہ کرم ہوگی تو یہ ان کی بھول ہے۔ جو لوگ تمام متبادل سے اوب کر اب سونیا جی کے چرنوں میں امان چاہتے ہوں انھیں تو بہرحال اب سونیا جی کے رحم و کرم پر ہی جینا ہوگا۔ کل تک تو یہ دھمکی بھی دے دیا کرتے تھے کہ اگر ہماری دادرسی نہ کی گئی تو ہم کوئی دوسرا مسیحا ڈھونڈ لیں گے لیکن اب تو ایسا کہنے کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

کانگریس ہو یا دوسری سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کی زبانی حمایت کا ان کے یہاں خاصا انتظام ہے۔ البتہ عملی طور پر یہ سب کے سب اسلام اور مسلمانوں کے درپے ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں اس کا بالکل الٹا کرتے ہیں۔ کوئی دن نہیں جاتا جب موجودہ وزیر اعظم عیسائیوں پر ہو رہے مظالم کی مذمت نہ کرتے ہوں لیکن ان کے اس زبانی جمع خرچ کے باوجود عیسائی ادارے مسلسل حملوں کی زد میں ہیں۔ کام کرنے والے اپنا کام کر رہے ہیں اور بیان دینے والے حکمرانی کی مصلحتوں کے تحت بیان دینے پر مجبور ہیں۔ اب اگر ان بیانات سے کسی کو یہ یقین ہونے لگے کہ واجپئی جی واقعی عیسائیوں کے خیر خواہ ہیں اور وہ اس ملک میں حضرت مسیح کا بول بالا چاہتے ہیں تو اسے سادہ لوحی بھی نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ سادہ لوحی کے لئے بھی تو بہرحال تھوڑی بہت عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

کانگریس نے اب تک پالیسی امور کے طور پر کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے مسلمانوں کے تئیں کسی خصوصی رویے کا پتہ چلتا ہو اور وہ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے ایسا کر بھی نہیں سکتی اس لئے کہ اسے ہندوؤں کا ووٹ بھی درکار ہے البتہ خیر سگالی کے بعض اشارے ضرور ملے ہیں۔ مولانا علی میاں کی رہائش گاہ پر پچھلے دنوں غیر قانونی چھاپے کے بعد سونیا گاندھی نے اپنا خصوصی نمائندہ اظہار ہمدردی کے لئے مولانا علی میاں کی خدمت میں بھیجا تھا جس سے غالباً یہ اشارہ دینا مقصود تھا کہ بی جے پی کے دور حکومت میں جہاں مسلمانوں کی مقتدر شخصیات بھی محفوظ نہیں،

جو لوگ اس وقت امت کی سیاسی قیادت پر قابض ہیں وہ یا تو ذاتی منفعت کے لئے متحرک رہنے والے افکار و نظریات سے خالی لوگ ہیں یا پھر وہ حضرات ہیں جنھیں دعوی تو دین کی فہم کا ہے لیکن وہ اس اہم نازک مسئلہ پر فیصلہ کرتے وقت کتاب و سنت سے کوئی رہنمائی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے

کانگریس کو اس صورت حال پر تشویش ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے صحیح تحفظ کا انتظام تو کانگریس ہی کر سکتی ہے۔ لیکن اس طرح کی علامتی پیش کش تو ماضی میں بھی دوسری حکومتیں کرتی رہی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ندوہ میں پولیس نے ہوسٹل کی تلاشی لی تھی اس وقت وزیر اعلی ملائم سنگھ مرکز کی کانگریسی حکومت پر بہت برہم ہوئے تھے اور انھوں نے پولیس کے اس اقدام پر بہت برا منایا تھا۔ وہ بھی یہی پیغام دینا چاہتے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے تحفظ کی سب سے زیادہ فکر بس انھیں ہے۔ کانگریس تب بھی مسابقت میں پیچھے نہ تھی۔ نرسمہا راؤ نے جعفر شریف کو خاص طور پر ندوہ بھیجا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کو یقین دلا سکیں کہ کانگریس مسلم اداروں کے تقدس کو پامال کرنا نہیں چاہتی۔ مرکز اور صوبہ دونوں اس صورت حال سے یکساں فائدے کشید کرنا چاہتے ہیں یعنی

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

مسلمانوں کے سامنے یہ سوال شدت سے سر اٹھانے لگا ہے کہ وہ ایسی صورت حال میں جب ہر چہار طرف اسلام دشمن پارٹیاں ان کے تحفظ کے لئے بڑے بڑے وعدے کر رہی ہیں ایسی صورت میں وہ کریں تو کیا کریں؟ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ اتنے اہم سوال کا جواب متعین کرنے کے لئے ہما شما ہر شخص کو آزادی حاصل ہے لہٰذا اس سوال کے

باقی صفحہ ۱۱ پر

ہمارا مقصد رسول اکرمؐ کے خوابوں کا ہندوستان ترتیب دینا ہے

بنگلور میں مسلم سیاسی پارٹی کے ماقبل آغاز اجلاس میں کنویز عبدالحمید سونور کا خطبہ استقبالیہ

ملی پارلیامنٹ کے قائد ڈاکٹر راشد شاز صاحب مندوبین اجلاس، عمائدین شہر اور خواتین و حضرات!

میں آپ سب لوگوں کا خیر مقدم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ اللہ کے خصوصی فضل اور آپ سب لوگوں کے تعاون سے اس اجلاس کا انعقاد ممکن ہو سکا۔ بہت شارٹ نوٹس پر اس اجلاس کا انعقاد کیا گیا لیکن الحمد للہ کہ جو لوگ اس اہم اجلاس کے اہم موضوع کو سمجھتے ہیں وہ اس میں شرکت کے لئے مختلف شہروں سے تشریف لائے۔ اللہ کا فضل ہے کہ بنگلور کے لاکھوں مسلمان میں سے آج سعید روحوں کو اللہ نے یہاں جمع کر دیا ہے۔ ہم جو کام لے کر اٹھے ہیں اس میں بڑے مجمع کی اہمیت نہیں بلکہ اس بات کی اہمیت ہے ہمارے شریک کار اس مشن میں کتنے سنجیدہ اور جذبہ قربانی سے سرشار ہیں۔

محترم بزرگو اور بھائیو!

اللہ کی کتاب مکمل نظام حیات فراہم کرتی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی دیتی ہے۔ قرآن و سنت کا یہ مطالبہ ہے کہ زندگی کے دوسرے گوشوں میں اس کی پیروی کے ساتھ ہی ریاست کی تشکیل بھی اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اللہ کے رسول نے اپنی موجودگی میں ایک کامل معاشرہ، ایک مکمل اسلامی ریاست تشکیل کر کے ہمیں مکمل اسلامی زندگی جینے کا طریقہ بتادیا۔ اس نظام کو آپ خلافت اسلامی کہیں یا نظام مصطفیٰ کہیں، خلافت راشدہ کہیں یا اہل تشیع کی زبان میں امامت کہیں یہ وہی نظام ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے نبیؐ کے وارث اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی جینے کے لئے اجتماعی زندگی کا نظم تشکیل دیں۔ افسوس کہ گذشتہ پون صدی سے اس امت سے نظام خلافت کا سایہ غائب ہے۔ خلافت کے سقوط کے بعد معاشرہ اور ملت خلیفہ کے بغیر ہے جب کہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ خلیفہ کی غیر موجودگی کا عرصہ تین دن سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جو موجودہ بے بسی ہے اس امت پر تو اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اس امت کا مرکز قوت کھو گیا ہے، نظام اسلامی معطل ہے۔ آج اس امت کو اس بات کا شعور بھی نہیں ہے کہ خلافت کے بغیر اس کی کوئی ملی اجتماعی زندگی نہیں ہو سکتی۔ حد تو یہ کہ اسلامی ایجنڈا ہے کیا اس کا شعور کم لوگوں کو ہے۔ کم ہی لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ اس امت کے پاس اپنا ایک سیاسی ایجنڈا ہے اور یہ کہ اس ایجنڈے پر حالات کیسے بھی خراب ہوں کوئی سمجھوتہ کوئی Compromise نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے ہمیں سیاسی زندگی کا جو تصور دیا اس کے مطابق ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کو صرف اور صرف کتاب و سنت کی بنیادوں پر منظم کرنا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کی عملی زندگی اس اسلامی اصول سے بہت دور ہو گئی ہے۔

جب ہم اپنے اردگرد اپنی سیاسی سرگرمیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ الیکشن کے موقع پر ہمارے باشعور لوگ اور علماء حضرات ہم سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ ہم سیکولر پارٹیوں کو ووٹ دیں، ہم غیروں کے لئے اپنی توانائیاں ضائع کریں جب کہ ہم میں سے ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ تمام پارٹیاں اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں مشترکہ موقف رکھتی ہیں۔ ہم میں کوئی اس رویے کو چیلنج کرنے والا نہیں کہ جب یہ تمام پارٹیاں امت کے سیاسی ایجنڈے کے لئے کام نہیں کر رہی ہیں تو انھیں آگے بڑھانے کے لئے مسلمان کیوں کام کریں۔

منقسم ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ملی پارلیامنٹ اور اس کے قائد ڈاکٹر راشد شاز نے اس فرسودہ سیاسی رویے پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ قائد ملی کا کہنا ہے کہ فی زمانہ ہندوستانی مسلمان فکری اور عملی ارتداد کی زد میں ہیں۔ اس کی نظریاتی بنیادیں کھوکھلی ہوتی جارہی ہیں۔ اس کا شفاف فکری سرچشمہ آلودہ ہوتا جارہا ہے یہاں تک کہ

وہ اب عملی زندگی میں ہر طرف سے ارتداد کے ماحول میں گھرا نظر آتا ہے۔ آپ نے صاف الفاظ میں یہ بات بتائی ہے کہ اسلام اور سیکولرزم ایک دوسرے سے کتنا متضاد اور باہم متحارب ہے اور یہ کہ مسلمان کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ اسلام کے دائرہ سے نکل کر سیکولرزم کے دائرے میں داخل ہو جائے۔ آپ نے یہ بات بھی کہی ہے کہ ایک اسلامی ایجنڈا رکھنے والی امت اپنی کوششوں سے اپنے ووٹ سے غیر اسلامی ایجنڈا رکھنے والی سیاسی پارٹی کو اقتدار نہیں بخش سکتی۔ یہ فقہی مسئلہ ہے اور جان لیجئے کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ مسلمان غیر اسلامی سیاسی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے کسی پارٹی کو تعاون دیں۔ ایسا کرنا شریعت کے نقطہ نظر سے حرام ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ارتداد کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے، یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت امت میں بہت سی جماعتیں اور ادارے دین کے حوالے سے کام کر رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں باہمی اتحاد و اتفاق تو دور کی بات شاید ہی کسی کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو۔ رہی یہ بات کہ مستقبل کا ہندوستان کیا ہوگا اور ہم کیسا ہندوستان تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ان باتوں پر کم لوگوں نے اتنی گہرائی سے غور کیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امت کے مختلف گروہ جو اس ملک میں اسلامی تبدیلی کے لئے کام کر رہے ہیں یہ سب ہمارا اجتماعی سرمایہ ہیں۔ ہم ان تمام مسالک کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہم سب لوگوں کی اجتماعی کوشش سے اس ملک میں نئی تبدیلی آسکے۔ ایک منشور، ایک رسول اور ایک قرآن رکھنے والی امت کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا اس ملک میں ایجنڈا کیا ہے؟ اور پھر پوری امت کو اس ایجنڈے پر کام کرنے کے لئے زور و شور سے متحرک کیا جائے تاکہ اس ملک میں غلبہ اسلام کی راہ ہموار ہو۔

ڈاکٹر راشد شاز صاحب میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالی نے اس امت پر خاص فضل کیا ہے کہ اس نے آپ کی ذات میں امت کو ایک قائد سے نوازا ہے۔ آپ کی فکر اس بے سمت امت کو پھر سے دوبارہ اسلامی خطوط پر منظم کرنے کا کام انجام دے رہی ہے۔ کم از کم میں اپنی حد تک تو یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں فکری اور نظری اعتبار سے دوبارہ مسلمان ہوا ہوں، تو ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی وجہ سے اور جہاں جہاں بھی ڈاکٹر صاحب کی چیزیں پہنچتی ہیں ہم جیسے نہ جانے کتنے دلوں میں جو اسلامی زندگی کے شعور سے خالی اپنی اپنی زندگی میں مست تھے ان کے دلوں میں اسلام کو غالب کرنے کی آرزو پیدا ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کو میں اپنا محسن تصور کرتا ہوں لیکن افسوس کہ ہم سے اس مقدس مشن کو جو سرگرم تعاون ملنا چاہئے تھا نہیں مل رہا ہے، مجھ سے بھی کوتاہی ہو رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت پوری امت اس عظیم دعوت کو تعاون فراہم کرنے میں جس پس و پیش کا مظاہرہ کر رہی ہے یہ اس کے

ہمارا اصل مقصد سیاسی پارٹی کا قیام نہیں بلکہ رسول اکرم کے خوابوں کا ہندوستان ترتیب دینا ہے۔ سیاسی پارٹی تو اس راہ کا ایک پتھر ہے، یہ ہماری منزل نہیں

لئے کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس تحریک کو ایک فیصلہ کن قوت فراہم نہ ہوئی اور امت نے اس مشن کو خاطر خواہ تعاون فراہم نہ کیا تو اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو بڑا دھچکا لگے گا۔ البتہ میں جہاں بھی گیا ہوں میں نے محسوس کیا ہے کہ روایتی مسلم قائدین اور ملی تنظیموں کی سرد مہری کے باوجود عوام الناس نے ہمارا پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔ جو لوگ احتیاط کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں ان سے بھی جب میں نے تھوڑی دیر گفتگو کی ہے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی نظری طور پر ہماری باتوں کو سچ ماننے پر مجبور ہیں البتہ مصلحتیں انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ میں پرامید ہوں کہ دیر یا سویر یہ باتیں ہماری سمجھ میں آئیں گی اور اگر ہم واقعی اپنے لئے ایک بہتر مستقبل چاہتے ہیں تو آج نہیں تو کل ہمیں اسی راستے کو اختیار کرنا ہوگا۔

آج کا یہ اجلاس آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ اس انقلابی دعوت کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کریں اور اگر آپ کا دل مطمئن ہو جائے تو اس مشن کو آگے بڑھانے میں ہر طرح ہمارا ساتھ دیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ملی پارلیامنٹ نے امت کی فکری قیادت کا کام ایک ایسے نازک لمحے میں سنبھالا جب بابری مسجد کی شہادت کے بعد تمام روایتی قیادت زمیں بوس ہو چکی تھی۔ عام مسلمان خوف زدہ اور مایوس تھا، بڑی بڑی زبانیں بند ہو چکی تھیں شاید ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا ایسے نازک صورت حال میں ملی پارلیامنٹ نے دہلی کی سرزمین پر اپنا پہلا اجلاس منعقد کیا اور عام مسلمانوں کو یہ دعوت دی کہ آؤ ہمت ہارنے کے بجائے اس ملک میں ایک انقلابی تبدیلی کے لئے منصوبہ بند جدوجہد کی جائے۔ میں اس کے پہلے اجلاس میں شریک تھا جس میں ڈاکٹر شاز صاحب نے سارے ہندوستان سے مضطرب اور سنجیدہ مسلمانوں کو ایک نئی شروعات کے لئے اجتماعی غور و فکر کی دعوت دی تھی۔ اس موقع پر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر مختلف مسالک اور مکاتب فکر کے لوگ ملک کے مختلف گوشوں سے کھنچے چلے آئے تھے۔ فکری اور عملی صف بندی کا یہ کارواں آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۹۶ء کے پٹنہ اجلاس میں مسلم سیاسی بل کا مسودہ سامنے لایا گیا اور وہیں سے ہندوستانی مسلمانوں نے ایک نئے سیاسی رویے کا اعلان کیا۔ ملی فرمان جاری کیا گیا جس میں مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کی بات کی گئی۔ یہ بتایا گیا کہ ہمارا سیاسی ایجنڈا دوسروں کے سیاسی ایجنڈے سے الگ ہے پھر مارچ ۱۹۹۷ء میں ہبلی کے مذہبی اجلاس میں پچاس سالہ ملی کاموں کے احتساب کے بعد ایک مسلم

منشور جاری کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت وضاحت سے بتایا کہ پچھلے پچاس سالوں میں ہم سے کیا غلطیاں ہوتی رہیں۔ ان غلطیوں کے اعتراف کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک تسلسل اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ پٹنہ اجلاس میں اس بات کے اعلان کے بعد کہ مسلم امہ ایک فکری گروہ ہے اس کے پاس ایک سیاسی لہجنڈا ہے، ملی پارلیامنٹ مسلسل اس بات کے لئے کوشاں رہی ہے کہ اس ملک میں ایک اسلامی متبادل کی تیاری کا کام جلد از جلد تکمیل کو پہنچے۔

الحمدللہ کہ اب لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی ہے کہ مختلف پارٹیوں میں پائے جانے والے مسلمان ہمارے نمائندہ نہیں ہیں۔ نام ان کا مسلمانوں جیسا ہو لیکن وہ غیر اسلامی لہجنڈے کے لئے کام کر رہے ہیں اس لئے ہمیں ان کے مسلم ناموں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ مصیبت یہ ہے کہ بہت سے لوگ مسلم سیاست کے ذریعہ ان پارٹیوں میں پہنچے ہیں۔ جب ہم نے مسلم سیاسی پارٹی کے اس ماقبل افتتاح اجلاس کا شہر بنگلور میں پروگرام بنایا تو بہت سے لوگوں نے اس شبہہ کا اظہار کیا کہ ایسی باتیں تو پہلے بھی ہوئی ہیں بہت سے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا نعرہ لے کر آگے بڑھتے ہیں لیکن جب ان کے گرد لوگوں کا ایک حلقہ اکٹھا ہو جاتا ہے، ان کا کچھ سیاسی وزن ہو جاتا ہے تو وہ کسی غیر مسلم پارٹی میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے سیاسی مسلمان جو اس وقت مختلف سیاسی پارٹیوں میں اہم عہدوں پر ہیں انھوں نے مسلمانوں کو مایوس کیا ہے۔ یقیناً امت نے بہت دھوکے کھائے ہیں لیکن ہماری دعوت اس اعتبار سے مختلف ہے کہ ہم وہ پہلے لوگ ہیں جو اس ملک میں اسلامی سیاسی لہجنڈے کے احیاء کے لئے اٹھے ہیں۔ جو لوگ ہمارے اردگرد اکٹھا ہو رہے ہیں انھیں خوب معلوم ہے کہ یہ ایک طویل راستہ ہے، یہاں فوری طور پر کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ ہمارا اصل مقصد سیاسی پارٹی کا قیام نہیں بلکہ رسول اکرم کے خوابوں کا ہندوستان ترتیب دینا ہے۔ سیاسی پارٹی تو اس راہ کا ایک پتھر ہے، یہ ہماری منزل نہیں اس لئے اس انقلابی تحریک پر عام سیاسی مہم جوئی کا دھوکہ نہیں ہونا چاہیئے۔

یہ ہم سبھوں کی خوش قسمتی ہے کہ نئی مسلم فکر کی تفہیم کے لئے ہمارے درمیان ڈاکٹر صاحب بذات خود موجود ہیں جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ اس وقت مسلم سیاسی فکر میں تطہیر کی ضرورت کتنی ناگزیر ہے۔

بقیہ اسلام مسلمان اور کانگریس

متضاد جواب موجود ہیں۔ جو لوگ اس وقت امت کی سیاسی قیادت پر قابض ہیں وہ یا تو ذاتی منفعت کے لئے متحرک رہنے والے افکار و نظریات سے خالی لوگ ہیں یا پھر وہ حضرات ہیں جنھیں دعوی تو دین کی فہم کا ہے لیکن وہ اس اہم نازک مسئلہ پر فیصلہ کرتے وقت کتاب و سنت سے کوئی رہنمائی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ اگر کتاب و سنت کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر نہ تو تحفظ کی تلاش میں ۱۰ جن پتھ تک جانے کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کفار و مشرکین کے خالی خولی وعدے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر سکیں گے۔ اور نہ ہی کسی کے لئے یہ موقع رہے گا کہ وہ مسلمان کارکنوں کی بدولت مسلمانوں کی جدوجہد کے ذریعے اپنی پارٹی کے مذموم خواب کی تکمیل کی سوچ سکے اور نہ ہی مسلمانوں کی شب و روز محنت پر نظام کفر کی عمارت مستحکم کی جاسکے گی۔

سونیا گاندھی ہوں یا ملائم سنگھ، لالو یادو ہوں یا مسٹر واجپئی یہ سب اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر شب خون مارتے ہیں اور وہاں سے خدام کی فوج حاصل کر لیتے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس امت کے باشعور لوگ مداہنت میں مبتلا ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کو یہ بتانے سے گریز کرتے ہیں کہ دوسری پارٹیوں میں مسلمانوں کا داخلہ ایک ناقابل معافی گناہ ہے، ایک ناقابل برداشت صورت حال ہے ایسا کرنے سے رسول اکرمؐ سے ہماری بیعت ٹوٹ جاتی ہے، ہماری مسلمانیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ امت کی بے شعوری سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے خیمے کو منتشر دیکھ کر ہر مہم جو اپنے رضاکاروں کی فوج اسی امت سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اے کاش کہ آخری رسول کی اس توہین پر ہمارے اندر اضطراب کی عام کیفیت پیدا ہو پاتی اور تحفظ کی تلاش میں کفار و مشرکین کی طرف دیکھنے کے بجائے ہماری نگاہیں آسمانوں کی طرف اٹھتیں اور اے کاش دوسری سیاسی پارٹیوں کے دست و بازو بننے کے بجائے رسول اکرم کے سیاسی خواب کو سچ کر دکھانے کے لئے اس ملک میں مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے لئے حوصلہ جٹا پاتے۔

کانگریس میں مسلمانوں کی واپسی کانگریس کے لئے یقیناً فال نیک ہے کہ اسے مفت کے پرجوش خادمین کی فوج ہاتھ آجائے گی۔ البتہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے اس ملک میں اسلام کے مستقبل میں آخری کیل ٹھونک دینے کے مترادف ہے کہ اگر مسلمان تمام سیاسی متبادل سے تنگ آکر کوئی نیا اسلامی متبادل دریافت کرنے میں ناکام رہے اور دوبارہ پھر اسی قطار میں لگ گئے جہاں پچاس سال سے قسطوں میں موت بٹتی رہی ہے تو پھر مستقبل کے مؤرخ کو فاتحہ پڑھنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لاقدر اللہ۔

بار بار ایک ہی بل سے ڈسے جانے کے باوجود مسلمان کس خزانے کی امید میں دوبارہ اسی بل میں انگلی ڈال دیتے ہیں

بنگلور اجلاس میں علامہ باقر حسین شاذ مدیر "ساز دکن" کا کلیدی خطبہ

عزیز برادران اسلام اور دختران ملت

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کسی بھی قوم کی زندگی میں ۵۰ سال کا عرصہ کوئی طویل عرصہ نہیں ہوتا لیکن ایک مجبور بے بس قوم اس عرصہ میں اپنی قوت و توانائیوں کو مہمیز دینے اور نئی طاقت سے دوبارہ ابھرنے کے لئے پر تول سکتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے انگریزوں کے دور اقتدار سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے بعد اس ملک کی ہی ایک مذہبی اکثریت کے زیر تسلط اقتدار کو قبول کیا اور پچاس سال یوں ہی گذار دیئے۔ اس دوران ان کے مضمحل قویٰ اور مضمحل ہوتے چلے گئے۔ مسلمانوں نے خدا کے دین کی دعوت اسی ملک کے دیگر ابنائے وطن تک پہنچانے سے لے کر اپنی سیاسی، معاشی و سماجی ترقی کے لئے اگر جائزہ لے کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ وہ فٹ بال کے ایک گولے کی طرح کبھی اس جانب اچھالے جاتے رہے تو کبھی اس جانب اچھالے جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اقتدار وقت کی جانب سے یا جارحانہ ہندو احیا پرستوں و فسطائی عناصر کی جانب سے فرقہ وارانہ فسادات برپا کر کے مسلمانوں کی جان و مال کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا رہا، ان کی معیشت کو برباد کرنے کے لئے کئی ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ ذہنی غلامی کے لئے فرنگیوں کا دو سو سالہ دور اقتدار کافی نہیں تھا کہ ہندوؤں نے اپنی دور حکمرانی میں مسلم اقلیت کو پوری طرح کچل دینے کی زبردست کوششیں کیں۔ ہندوستان کی کوئی سیاسی زیر ترتیب جماعت ایسی نہیں جس نے مسلمانوں پر حکومت نہ کی ہو۔ ان حکومتوں کے طرز عمل کا مشاہدہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں بلکہ سیکولر کہلانے والی کانگریس کا عمل کمیونل بی جے پی کے عمل سے سو گنا زیادہ فرقہ پرستانہ اور فاسشٹ ثابت ہوا ہے۔ اب عام مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی یہ سوال کلبلانے لگا ہے کہ پچاس سال تک "سیکولر" لیڈروں کی جے جے کار کرتے ہوئے ہم خود کہاں
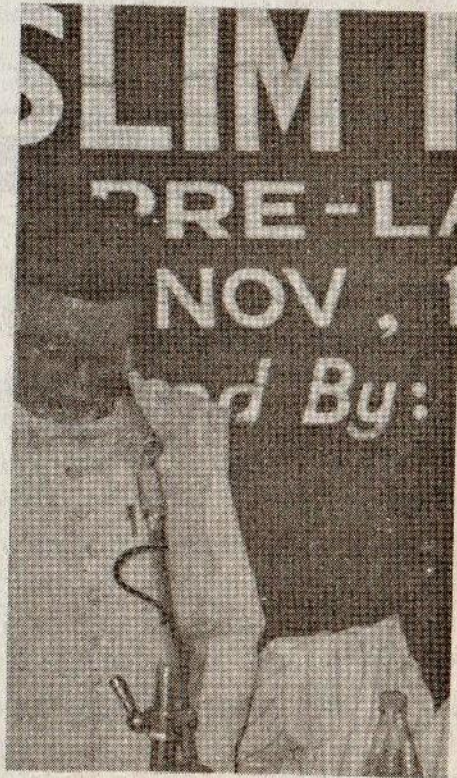
کھڑے ہیں اور ہم سے کہیں زیادہ کمزور، پچھڑی و کم تعداد کی ذاتوں نے اپنے ایک آدمی کو لیڈر مان کر خود ہمیں سے ووٹ لے کر ہمیں بھی پیچھے دھکیل کر ہم سے آگے نکل گئی ہیں۔ مجموعی طور پر مسلمان کسی سیاسی غیر مسلم جماعت کا ووٹ بنک بنتے رہے یا پھر تمام جماعتوں کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ جوابی رد عمل کے طور پر ان جماعتوں نے اپنے چند حاشیہ بردار نام نہاد مسلم قائدین کو چند نشستیں دے دیں یا پھر کسی منسٹری کا لالچ دے کر اپنا الو سیدھا کیا۔ کبھی کسی کارپوریشن یا ادارہ کی صدارت انھیں سونپ دی۔ سیاسی، معاشی و سماجی میدانوں میں آبادی کے تناسب کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ بہ حیثیت مجموعی مسلمانان ہند کے مفادات کو خود مسلم علماء، قائدین، سماجی شخصیات اور اقتدار کے حامل سیاسی جماعتوں کے

سربراہوں نے پیش نظر نہیں رکھا۔ بلکہ مسلمانوں کی جہالت، نااتفاقی اور ناسمجھی کا اپنوں نے اور اغیار نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جہاں تک سیکولر پارٹیوں کا سوال ہے یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ بنیادی طور سے ہندوستان میں کوئی پارٹی سیکولر نہیں ہے بلکہ موقع پرست عناصر نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سیکولرازم کا چولا اوڑھ رکھا ہے اور ان کی یہ موقع پرستی کب انھیں اسے اتار پھینکنے پر

مجبور کردے اور فرقہ پرست بنادے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ کانگریس نے اقتدار پر باقی رہنے کے لئے شیلانیاس کروایا، اس نے ہندووں کے ووٹ بنک کو محفوظ رکھنے کے لئے ایودھیا میں بابری مسجد شہید کرنے والے جارحانہ ہندو جنونی فرقہ پرستوں پر گولی نہیں چلائی، اس پر موقوف نہیں بلکہ علاقائی پارٹیاں بھی اپنے طور پر بدترین فرقہ پرست و مسلم دشمن جماعت بی جے پی کو مرکز میں سنبھالا دیئے ہوئے ہیں اور ان کا یہ بہانہ ہے کہ اگر وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی تائید سے دستبرداری اختیار کرلیتی ہیں تو مرکزی حکومت گر جائے گی اور ملک میں عدم استحکام کا دور دورہ ہوگا اور بدامنی و نراج پیدا ہوجائے گا۔

مسلمانوں کا اس ملک میں کوئی بھی دوست نہیں، اگر ہے بھی تو مستقل دوست نہیں فرقہ پرستوں کی مستقل دوستی تو اقتدار سے ہے بقیہ سب عارضی اور وقتی، اسی لئے یہ بنیادی طور سے موقع پرست اور اقتدار پرست لوگ ہیں، یہ حقائق ہر فساد کے وقت واضح ہوتے ہیں، ہمیں اپنے دشمنوں کی صحیح پہچان ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اور حالات تھوڑے موافق ہوتے ہیں تو پھر ہم لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ انھیں دشمنوں کے سلسلہ میں خوش فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں، ان سے ہاتھ ملاتے ہیں، ان سے کچھ معمولی مفادات کی خاطر اپنے آپ کو بہلاتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہم لوگ کسی بڑی تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہیں، مستقل جدوجہد کرنا نہیں چاہتے بلکہ چاہتے ہیں کہ حالات تھوڑے سدھریں تو اس میں ہم ایڈجسٹ ہوجائیں۔ حالات کو بدلنے کی نہ ہمیں فکر ہے نہ کوشش، اور یہی وجہ ہے کہ حالات بدل نہیں رہے ہیں بلکہ دن بہ دن تنگ ہوتے جارہے ہیں۔ بار بار ایک ہی بل سے ڈسے جانے کے باوجود ہم کسی خزانے کی امید میں اسی بل میں انگلی ڈال دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فرقہ پرست مسلمان دشمن طاقتوں کی پالیسیوں کو نظر میں رکھیں، فسادات کے اسباق کو یاد رکھیں۔ مسلمانوں کو غیر ملکی ایجنٹس قرار دینے کی کوشش کرنے والے تعلیم یافتہ ہندووں کو آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ دشمن کو دشمن سمجھا جائے اور اس سے مقابلہ کیا جائے اور انھیں حالات میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کے بجائے اس میں تبدیلی کے لئے جدوجہد کی جائے کیونکہ آج ملت اسلامیہ ہند کا مستقبل (۲۵ کروڑ مسلمانوں کا مستقبل) ان احیا پسند تنگ نظر ہندو فرقہ پرست جماعتوں یا نام نہاد مسلم مفادات کی نگہبانی کا دعوی کرنے والی پارٹیوں

مسلمانوں کو اپنے وجود اور بقاء کے لئے اس ملک میں واحد نمائندہ مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دے دینی چاہئے جس میں آزمائے ہوئے پیشہ ور سیاست دانوں کے بجائے نئی نسل کے نوجوان مفکرین جن میں ملت اسلامیہ کے تحفظ اور بقاء کا جذبہ ہو، ان ہی کے ہاتھوں میں ملت اسلامیہ کی قیادت کی باگ ڈور دے کر ایک نئی جہت کا آغاز کریں۔

کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہے، اب ایک انقلابی صدا بلند کرنا ضروری ہے۔

انتہائی افسوس اور دکھ کی بات یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہندوستان ایک ایسا سیاسی ملک ہے جس کی جمہوری و آئینی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہوچکی ہیں۔ ایک مخصوص فسطائیت نواز ہندو گروہ کی دہشت گردی اور ساتھ ہی سیاست کے کھوکھلے اور جرائم پیشہ نمائندوں کی لوٹ مار سے پوری طرح لرزہ طاری ہے۔ دوسری جانب مسلم سیاسی رہنما کنویں کے مینڈکوں کی طرح صرف اپنی چار دیواری یا مفادات کے خول سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں سکتے۔ مسلم رہنماؤں کو ملکی جمہوریت کے ڈھانچہ کے زیر سایہ اپنے سفر کی سمتیں متعین کرلینی چاہئے تھی لیکن ان قائدین نے بارہا اپنی خود غرضی، مفاد پرستی و بے ضمیری کے ذریعہ ملکی مسلمانوں کے مستقبل کو مزید تاریکی کے غار میں ڈھکیلنے کا کام ہی کیا ہے۔ آج ملک تیز رفتار سیاسی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے اور فیصلہ کن مرحلہ آچکا ہے۔ ملی پارلیمنٹ کے پٹنہ میں ۱۴ اور ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ کو منعقدہ اجلاس میں بھی اسی نکتہ پر زور دیا گیا تھا کہ موجودہ سیاسی نظام میں ملک کے مسلمانوں کو بے بسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا ہے لیکن مسلمان اپنی عددی طاقت کے ذریعہ اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔ ایک ایسی مسلم سیاسی پارٹی کی ضرورت اب ضرورت ہی نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت بن گئی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کو اپنے وجود اور بقاء کے لئے اس ملک میں واحد نمائندہ مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دے دینی چاہئے جس میں آزمائے ہوئے پیشہ ور سیاست دانوں کے بجائے نئی نسل کے نوجوان مفکرین جن میں ملت اسلامیہ کے تحفظ اور بقاء کا جذبہ ہو، ان ہی کے ہاتھوں میں ملت اسلامیہ کی قیادت کی باگ ڈور دے کر ایک نئی جہت کا آغاز کریں۔ اسی سلسلہ میں یہ اجلاس (بنگلور میں) بلایا گیا ہے۔ سیاسی بازی گروں کی عیاری سے اس ملک کے مسلمان تنگ آچکے ہیں۔ ملت کے مفادات کا سودا کرنے والے سوداگروں سے بھی ان کو نفرت ہے اب کریں تو کیا کریں؟ سیاسی، سماجی و معاشی انصاف کے لئے وہ دستوری چوکھٹے میں رہتے ہوئے ملک میں ایک نئی صف بندی کیوں نہیں کرسکتے؟ کیا علماء و قائدین اور رہبران ملت نے اس پر کبھی غور کیا ہے؟ ملی پارلیمنٹ کا پٹنہ اجلاس اس ملک کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل تھا اور اب یہ بنگلور کا اجلاس بھی ایک تاریخی و فیصلہ کن اجلاس ثابت ہوگا جس سے ملت اسلامیہ ہند کی

مسلمان اب اور دھوکے میں نہ آئیں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ملی پارلیامنٹ کی آواز کو لبیک کہتے ہوئے ایک مسلم واحد نمائندہ سیاسی پارٹی سے وابستہ ہوجائیں۔ یہی راستہ توازن طاقت کی برابری کا ہے اور یہی ہمارے لئے مفید بھی ہے۔

سیاسی شیرازہ بندی کی جاسکے گی۔ ہماری سیاسی بصیرت کا اظہار بہت پہلے ہی ہو جانا چاہئے تھا۔ میں یہ کہنے میں بالکل ہی حق بجانب رہوں گا جب کہ میں یہ کہوں کہ ملت اسلامیہ ہند کو مسائل دشواریوں کی عمیق کھائی میں ناسمجھ مسلم قیادت نے ہی گرایا ہے۔ اب اگر وہ اوپر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے تو ان قائدین کو کوئی تشویش نہیں ہونی چاہئے۔ ملت کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ان کے لئے بنیادی اہمیت کے حامل مذہبی مسائل کے حل کے لئے مذہبی قائدین اور مسلم سماج میں اثر رکھنے والے یہ ملا و مولوی حضرات کوئی حرکت و سعی نہیں کرتے۔ وہ ان سے لاپرواہی اور بے اعتنائی برتتے ہیں اور بعض اوقات ان کا رویہ ملت کے لئے مزید مسائل پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ دین و دنیا کی تفریق پیدا کر کے اور سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دیتے ہوئے زمام کار کو باطل طاقتوں کے ہاتھ میں ان مشائخین، سجادگان، متولیان اور نیک و بظاہر خداترس بندوں نے دے دیا ہے اور باطل کی فرماں روائی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت بھی کر رہے ہیں۔ "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" کے مصداق آج کی پراگندہ و جرائم پیشہ سیاست سے کنارہ کشی ان کی نظر میں تو بہت بھلی معلوم ہوتی ہوگی لیکن اس طرح ان علماء و قائدین نے اپنی عافیت کا ایک گوشہ ڈھونڈ لیا ہے۔ جب ملک تباہ ہوگا اور یہاں کا ہر شعبہ لادینیت کے زہر سے متاثر ہوگا تو یہ علماء و مشائخ اور رہبران ملت کہلانے والے افراد کس طرح بچے رہیں گے۔ کیا یہ لوگ بنی اسرائیل کی طرح تھوڑے دین پر اکتفا کئے ہوئے ہیں؟ ایک مکمل دین کے ماننے والے شعبہ سیاست کو، معیشت کو لادین و خدا بیزار افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں، کس قدر حیرت کا مقام ہے۔

کہیں اسپین کی تاریخ ہندوستان میں نہ دہرائی جائے۔ ہندوستان کی بھی سیاسی پارٹیاں یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتیں کہ مسلمانوں کو اپنا وزن محسوس کرنا چاہئے اور سوچ سمجھ کر ووٹ کا استعمال کرنا چاہئے لیکن بغور دیکھا جائے تو مسلمانوں کے سارے ووٹ اکثریتی فرقہ والی جماعتوں کو مل جاتے ہیں جو مجموعی طور پر مسلمانوں سے گویا مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہوں تو یہاں کی قدیم تہذیب ہندو سنسکرتی کو تسلیم کرتے ہوئے رہیں۔ سیاسی طور پر مسلمانوں کا وزن کوئی محسوس نہیں کرتا لہٰذا ملی پارلیامنٹ موجودہ ریاستی اسمبلی انتخابات کے موقع پر رائے دہی کے حق کے استعمال یا عدم استعمال کے بارے میں بھی غور کرے اور یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیاسی پارٹیاں اب مسلمانوں کی مفت حمایت کے حصول کی توقع نہ رکھیں۔ وہ اب سیاسی شعور کے تحت دیکھ بھال کر ہی فیصلے کرنے والے ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کا صحیح ہمدرد و غم خوار کوئی نہیں، یہ بات ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر کھڑے رہ کر ساری دنیا کو بتا دینی چاہئے اور یہ بھی یہ اہم بات۔ موسم آتے جاتے رہتے ہیں، ایک الیکشن آیا ہے چلا جائے گا، دوسرا انتخاب بھی آئے گا چلا جائے گا۔ لیکن اصل سوال تو بہر حال ملک کے مسلمانوں کے مستقبل سے جڑا ہے۔ مسلمان اب اور دھوکے میں نہ آئیں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ملی پارلیامنٹ کی آواز کو لبیک کہتے ہوئے ایک مسلم واحد نمائندہ سیاسی پارٹی سے وابستہ ہو جائیں۔ یہی راستہ توازن طاقت کی برابری کا ہے اور یہی ہمارے لئے مفید بھی ہے۔ مسلسل ٹھوکریں کھاتے کھاتے مسلمان اس کے عادی تو ہو چکے ہیں لیکن ہم اس ملک کے فرقہ پرست و فسطائی عناصر اور ملت کا سودا کرنے والے مسلم قائدین کو خبردار کرتے ہیں کہ اب مسلمانوں کے لئے صرف دو راستے رہ گئے ہیں یا وہ پھر ایک بار پے در پے دھوکہ بازیوں کا شکار بنے رہیں یا پھر علیحدہ سیاسی قوت کا اظہار کر کے ایک ایسی راہ متعین کر لیں جو کہ قوموں کی زندگی کی ضمانت بنے۔ وہ اب اس ملک میں آئندہ رونما ہونے والے حالات کا تھوڑا سا اندازہ کر لیں اور ابھی سے اس سیلاب بلا سے نمٹنے کی تیاری کر لیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ نہ صرف اپنے اور اپنی نئی نسل کے مستقبل کو محفوظ پائیں گے بلکہ کل خدا کے آگے بھی وہ جواب دے سکیں گے کہ ہم نے تیری دی ہوئی عقل و بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے ملک میں اسلام کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کو روشن رکھا بلکہ اس کو ایک شعلہ کی طرح تابندہ کر دیا۔ آج اس ملک کے دردمند و مخلص مسلمانوں و مظلوموں کو بنگلور اجلاس سے بیحد توقعات وابستہ ہیں۔ وہ اس اجلاس کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہیں اور سیاہ رات کے ختم ہونے کے منتظر ہیں جو کہ آزادی کی صبح کے بعد سے نمودار ہوئی تھی۔ حقیقی بات تو یہ ہے کہ ہم نے آزادی کی صبح دیکھی ہی نہیں، آزادی کے ثمرات سے ہندوستانی مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟ مسلمانوں میں سیاسی اتحاد کی کمی نہیں رہی بلکہ دوسروں سے زیادہ رہی ہے۔ لیکن یہ اتحاد کسی فراڈ سیکولر لیڈر کو اپنا قائد مان کر اسے طاقتور بنانے کے لئے ہوتا رہا۔ ایک قائد سے موہ بھنگ ہونے پر دوسرے پھر تیسرے کو انھوں نے اجتماعی طور پر ہی قائد بنایا۔ قائدین کی تبدیلی کے سوا انھوں نے اپنی سیاسی طاقت بنانے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی اور آج یہ تاریخی کوشش رنگ لاتی دکھائی دے رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ بار آور ہو اور اس ملک میں ہماری باعزت و آبرومندانہ زندگی گزارنے کی راہ ہموار کرے۔ میں بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تاریخی و سعادت مندانہ کام میں ہمارے حصہ کو آخرت میں ہمارے لئے بہترین زاد راہ بنائے۔ (آمین ثم آمین)

> مسلمانوں کو غیر ملکی ایجنٹس قرار دینے کی کوشش کرنے والے تعلیم یافتہ ہندوؤں کو آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ دشمن کو دشمن سمجھا جائے اور اس سے مقابلہ کیا جائے اور انھیں حالات میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کے بجائے اس میں تبدیلی کے لئے جدوجہد کی جائے۔

ہندوستانی مسلمان سیاسی ارتداد کی کیفیت سے دوچار ہیں

بنگلور اجلاس میں قائد ملی ڈاکٹر راشد شاز کا فکر انگیز خطاب

اس ملک کے مجبور و مقہور اور بے بس مسلمانو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسلم سیاسی پارٹی کے باقاعدہ اعلان سے پہلے بنگلور میں جب اس جلسے کو منعقد کرنے کا جب اعلان کیا گیا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے پہلے کہ ایک مسلم سیاسی پارٹی کا باقاعدہ وجود عمل میں آئے، ملک بھر میں باشعور دردمند مسلمانوں کو یہ موقع مل سکے کہ وہ اس کے دست و بازو بن سکیں گویا ہر دردمند دل تک ایک سیاسی پارٹی بنانے سے پہلے ہم دستک دے سکیں۔ یہ اسی دستک کا ایک حصہ ہے کہ ہمارا چھوٹا سا قافلہ لٹے پٹے خستہ حال مسلمان آپ کے شہر بنگلور میں آئے ہیں۔

برادران گرامی اور دختران ملت!

اس ملک میں جہاں عمومی تاثر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں، ایک ایسے ملک میں مسلم سیاسی پارٹی کا آخر کیا جواز ہے؟ یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ کیا اس ملک میں کوئی مسلم سیاسی پارٹی کامیاب بھی ہو سکتی ہے؟ اس لئے کہ مسلم ڈیموگریفی کا حال آپ کو معلوم ہے۔ مسلم آبادی منتشر ہے۔ ملک میں صرف ۲۴ ایسی پارلیمانی نشستیں ہیں جہاں مسلمان اپنی بنیادوں پر الیکشن میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تو یہ سوال ایک فطری سوال ہے کہ ایک مسلم سیاسی پارٹی کا منصوبہ اس ملک میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ پھر فوری طور پر غیروں کی طرف سے ایک Reaction یہ ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو قومی دھارے سے کاٹ کے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمان جو سیکولر پارٹیوں میں خلط ملط ہو گئے ہیں انھیں ہم وہاں سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا غیر مسلم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک اور پاکستان کی بنیاد رکھی جا رہی ہے لیکن یہ صرف غیر مسلموں کا خوف نہیں خود ہمارے درمیان دردمند مخلص قسم کے مسلمان کسی ایسے خیال سے خوف کھاتے ہیں کہ ہمارے اوپر ابھی ہی کیا کم مصیبت ہے کہ مزید ایک مسلم سیاسی پارٹی کا ڈول ڈالا جائے اور ملک میں نئے ہنگامے، نئے خطرات مسلمانوں کے لئے پیدا ہو جائیں۔

برادران گرامی! اس ملک میں حادثے تو مسلمانوں کے ساتھ بہت سے ہوتے رہے۔ ۱۸۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی موت کے بعد کوئی ڈیڑھ سو سال کا وقفہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان ایک ایسا رخ اختیار کرتا ہے جہاں وہ مسلمان جو اس ملک میں ہزار سالہ حکمرانی کا تجربہ رکھتے تھے انھیں اپنے تحفظ کی کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ سلطنتیں مملکتیں ہاتھ سے نکلتی رہتی ہیں۔ انھیں دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن سب سے بڑا حادثہ جو اس ملک میں امت کے ساتھ پیش آیا ہے اور جس میں گذشتہ پچاس برسوں میں شدت آگئی ہے وہ یہ ہے کہ پچاس برسوں میں ہماری اس انداز سے Brain- washing ہوئی ہے کہ اب ہمیں خود معلوم نہیں کہ ہم ہیں کیا؟ ہم اس ملک میں کرنا کیا چاہتے ہیں اور ہم سے اللہ اور اس کا رسول اس ملک کیا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے؟ ظاہر ہے جب کسی قوم کا خواب ختم ہو جائے، اس کا نظریاتی سرمایہ چھن جائے تو وہ قوم صرف جسمانی وجود کی وجہ سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ صرف اس بنیاد پر اس

ملک میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی کہ اسے ملازمتوں میں حصہ مل جائے۔ اس کے لئے مختلف قسم کی سہولتیں حاصل کرلی جائیں، ریزرویشن دے دیا جائے، تعلیم کا فروغ ہو، ثقافت کو فروغ ہو یا معیشت اس کی بہتر ہو جائے۔ یہ چیزیں قوموں کو زندہ نہیں رکھتیں۔ ہمیں سمجھایا جاتا رہا ہے کہ اب ہم چونکہ اقلیت میں ہیں۔ ہندوستان کی اب صورت حال بدل گئی ہے اس لئے ہمیں اب اس ملک میں رہنا ہے تو اپنے موقف میں کچھ تبدیلی لانی ہوگی، لیکن رفتہ رفتہ موقف کی تبدیلی ہمیں اپنی بنیادی اسلامی شناخت سے اتنا دور لے گئی کہ اب ہم میں سے بہتوں کو اس بات کا علم بھی نہیں کہ ہم ہیں کون؟

برادران گرامی! میں آپ کی توجہ رسول اکرم کے اس آخری خطبے کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ جب اپنی وفات سے پہلے جمہور امت کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہی تھی۔ آپ نے اس امت کو جو وصیت کی تھی اور جو وعدہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ لوگو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے وہ پیغام پہنچادیا؟ لوگوں نے کہا، یقیناً ہم گواہ ہیں۔ آپ نے کہا پھر تم ان لوگوں تک اس پیغام کو لے جاؤ جو یہاں موجود ہیں۔ یہ ہے وہ رسول سے کیا گیا وعدہ۔ یہ ایک بیعت ہے، معاہدہ ہے، ہم نے آپ کے ہاتھوں پر یہ بیعت کررکھی ہے کہ ہم رسول اللہؐ کی پارٹی کے لوگ ہیں، ہم آپ کے ورکر ہیں، ہم اگر جھنڈا ڈھو سکتے ہیں تو صرف آپ کا، اپنی جانیں قربان کرسکتے ہیں تو صرف آپ کے مشن پر، کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا کام ہم سے کروائے۔ ہمارا معاہدہ رسول اکرمؐ سے طے ہو چکا ہے اور جب ہم کسی دوسرے لہ جھنڈے والے شخص سے اپنا معاہدہ کرتے ہیں تو گویا رسول اللہ سے ہم اپنا معاہدہ توڑ لیتے ہیں۔ ہمارا تعلق اس امت سے ختم ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ رسول اکرم نے مدینہ میں ایک اسلامی ریاست کا جو ماڈل قائم کیا وہ گویا اس بات کی ابتداء تھی کہ آنے والے دنوں میں ان کی امت کو اسی نہج پر ایک عالمی اسلامی خلافت کے قیام کا کام انجام دینا ہے۔ رسول نے اپنی حیات مبارک میں ایک عالمی خلافت قائم نہیں کی بلکہ ایک چھوٹا سا ماڈل ہمیں دے گئے کہ ان خطوط پر اس امت کو آگے بڑھنا ہے اور آپ کو یاد ہے کہ جب آپ اس دار فانی سے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ بڑے سکون کے ساتھ تشریف لے گئے اس لئے کہ آپ یہ وعدہ امت سے لے چکے تھے کہ جو کام آپ نے کر دکھایا ہے، جس کی بنیاد آپ نے رکھ دی ہے۔ یہ امت اس کام کو جاری رکھے گی۔ رسول اکرمؐ دنیا کے پہلے نبی ہیں جن کی آمد کے ساتھ ہی نبوت کے خاتمے کا اعلان بھی ہو جاتا ہے۔ ان سے پہلے کوئی انٹرنیشنل پروفٹ (پیغمبر) دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی آزادی کے لئے بھیجے گئے اور آپ دیکھیں کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی نبی موجود ہیں۔ لیکن

صرف اس بنیاد پر اس ملک میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی کہ اسے ملازمتوں میں حصہ مل جائے۔ اس کے لئے مختلف قسم کی سہولتیں حاصل کرلی جائیں، ریزرویشن دے دیا جائے، تعلیم کا فروغ ہو، ثقافت کو فروغ ہو یا معیشت اس کی بہتر ہو جائے۔ یہ چیزیں قوموں کو زندہ نہیں رکھتیں

ہم رسول اللہؐ کی پارٹی کے لوگ ہیں، ہم آپ کے ورکر ہیں، ہم اگر جھنڈا ڈھو سکتے ہیں تو صرف آپ کا۔ اپنی جانیں قربان کرسکتے ہیں تو صرف آپ کے مشن پر، کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا کام ہم سے کروائے۔ ہمارا معاہدہ رسول اکرمؐ سے طے ہو چکا ہے اور جب ہم کسی دوسرے لہ جھنڈے والے شخص سے اپنا معاہدہ کرتے ہیں تو گویا رسول اللہؐ سے ہم اپنا معاہدہ توڑ لیتے ہیں۔ ہمارا تعلق اس امت سے ختم ہو جاتا ہے۔

دنیا میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک عالمی پیغمبر کی بعثت کے ساتھ ہی ایک عالمی امت کا قیام بھی عمل میں آگیا۔ اب یہ اس امت کا کام قرار پایا کہ وہ اس لہ جھنڈے کو آگے لے جائے۔ گویا نبوت تو ختم ہو گئی، یقیناً ختم ہو گئی لیکن کار نبوت باقی ہے۔ جس کو اقبال نے کہا ہے کہ

نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

سچ پوچھئے تو ایک ایسی صورت حال کہ جب ایک عالمی اسلامی معاشرہ قائم ہو، اب پیدا ہوئی ہے۔ دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ ایک عالمی خلافت کے قیام کا ڈول ڈالا جائے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی بنیادی دعوت دراصل ایک سیاسی دعوت ہے۔ آپ جب یہ کہتے ہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو گویا آپ اس بات کا اعلان کر دیتے ہیں کہ زندگی جینے کا صرف ایک طریقہ آپ کے لئے معتبر رہ گیا ہے، وہ جو رسول اکرم کے ذریعہ آپ تک آیا، اس کے علاوہ کسی اور طریقے کو اگر آپ نے اہمیت دی تو آپ کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا اور پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اکرم کے وصال کے بعد امت نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اس لہ جھنڈے کو سرد پڑنے سے بچایا جائے۔ اندیشہ تھا کہ یہ لہ جھنڈہ منتشر ہو جائے، یہ کام رک جائے لہٰذا فوری طور پر ایک لیڈر شپ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ رسول اکرم کی تدفین کو مؤخر کیا گیا لیکن اس سے پہلے یہ کام کیا گیا کہ ایک خلیفہ ہمارے درمیان وجود میں آجائے۔ دو راتیں اور تین دن اسی سے فقہا نے استنباط کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عمرؓ کا جب آخری وقت آیا اور آپ نے چھ لوگوں کی ایک کمیٹی بنائی کہ ان کو خلافت کے مسئلے میں حتمی رائے دینی ہے تو آپ نے ایک ڈیڈ لائن رکھ دی کہ تین دنوں کے اندر ان لوگوں کو اپنے درمیان سے ایک خلیفہ منتخب کر لینا ہے۔ آپ نے یہ بھی حکم دے دیا کہ اگر تین دن سے زیادہ تاخیر ہوتی ہے تو ان چھ لوگوں کی گردنیں مار دی جائیں۔ یہ ہے وہ اہمیت رسول اکرم کے مشن میں ایک لیڈر شپ کی، رسول اکرم نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس کی گردن کسی امیر کی بیعت سے خالی ہو، خلیفہ کی بیعت سے خالی ہو وہ دراصل عالم جاہلیت میں موت کی طرف اپنے قدم بڑھا رہا ہے۔ یعنی ہمارا اسلام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہماری گردنوں میں خلیفہ کی بیعت

قائم نہ ہو۔ ہمارے اسلام کے مکمل ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ اسلام کا جو سیاسی نظام ہے، خلافت کا جو نظام ہے وہ اس دنیا میں موجود رہے۔ ہمارے درمیان ایک خلیفہ ہو، ایک امیر ہو۔ اس امت کے پاس ایک قرآن ہے، اس امت کے پاس ایک رسول ہے، اس امت کے پاس صرف ایک اور ایک لیڈر شپ کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "من اطاع امیری فقد اطانی ومن عصیٰ امیری فقد عصانی" کہ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔ یعنی امت کا خلیفہ دراصل آپ کی غیابت کے دور میں پوری امت کا نگہبان ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے بیعت لی تو آپ نے کہا کہ میں خلیفہ رسول اللہ کی حیثیت سے بیعت لیتا ہوں اور پوری کی پوری امت یعنی یہ پہلی امت ہے جس کو انٹرنیشنل پروفٹ ملا، آخری پیغمبر ملا، جس کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا، اس پوری امت کو کار نبوت انجام دینا ہے۔ پوری امت نائبین رسول کے منصب پر فائز کی گئی ہے۔ مستند حدیث میں تذکرہ آتا ہے کہ قیامت کے دن جب رسول اکرم کی شفاعت سے امت کے لوگوں کو جنت میں داخلے کی سبیل پیدا ہو رہی ہوگی تو دوسری امت کے لوگ پکار اٹھیں گے کہ "کادت هذه الامة ان تكون انبياء كلها" یہ کیا بات ہے کہ محمد کی امت کے ساتھ کیسا خصوصی معاملہ ہے، ایسا لگتا ہے کہ سب کے سب لوگ انبیاء کے منصب پر سرفراز کر دئے جائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ پہلی اور آخری امت ہے جو نبوت کے کام کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اس لئے ہم میں سے ہر آدمی نظری طور پر عملی طور پر دراصل رسول اکرم کا نائب ہے، ان کا ورکر ہے، ان کی پارٹی کا آدمی ہے اور Committed ہے اس بات کے لئے کہ وہ رسول اکرم کی شریعت کو، ان کے لائے ہوئے نظام حیات کو، اس دنیا میں نافذ کرے۔ یہ ہمارا ایک Commitment ہے رسول اکرم سے۔ اب دیکھئے کہ جس امت کے پاس ایک ایسا زبردست ایجنڈہ ہے، کرنے کا ایسا زبردست کام ہے اس کے ساتھ اس ملک میں یہ حادثہ ہوا ہے کہ پچاس برسوں میں جو سیاسی محکومی کی صورت حال بدلی ہے یعنی انگریزوں کی غلامی سے نکل کر جو کفار و مشرکین کی غلامی کا دور شروع ہوا ہے وہاں رفتہ رفتہ ان کی ایسی Brain-washing ہوئی کہ یہ بات ان کے دل و دماغ سے غائب ہو گئی ہے کہ وہ کون ہیں اور ان کو اس ملک میں کرنا کیا ہے؟ لہٰذا آپ دیکھیں کہ رسولؐ کے ورکرز، ان کے لوگ، ان کی پارٹی کے لوگ کفار و مشرکین کی پارٹیوں کے جھنڈے ڈھو رہے ہیں۔ اس میں کسی کو میرے خیال میں اختلاف نہیں ہے کہ اس وقت اس ملک میں جتنی سیاسی پارٹیاں یا غیر سیاسی غیر اسلامی پارٹیاں کام کر رہی ہیں، ان میں سے کوئی بھی رسولؐ کی شریعت کے نفاذ کے لئے کام نہیں کر رہی ہیں۔ ان کے خواب کو سچ کر دکھانے کے لئے کام نہیں کر رہی ہیں۔ خلافت اسلامی کے قیام کے لئے کام نہیں کر رہی ہیں پھر آخر یہ کیسے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قوت، مسلم نوجوان، مسلم مائیں، بہنیں ان پارٹیوں کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ وہاں اپنی قوت صرف کرتے ہیں۔ آپ کوئی بھی رپورٹ یعنی کوئی سیاسی ریلی منعقد ہو رہی ہو یا بڑا سیاسی جلسہ منعقد ہو رہا ہو آپ اردو اخبارات میں رپورٹ دیکھیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ ٹرکوں میں، بسوں میں، لوگوں کو بھر کے لانے والے، ریلیوں کو کامیاب بنانے والے، پولنگ بوتھ پر مارے جانے والے نوجوان یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ یہ کس لئے اپنی قوت ضائع کر رہے ہیں؟ یہ آخر چاہتے کیا ہیں؟ یہ اپنی زندگیاں پولنگ بوتھ پر کیوں ضائع کرتے ہیں؟ ہماری مائیں، بہنیں گھنٹوں قطار میں، چلچلاتی دھوپ میں، ٹھٹھرتی سردیوں میں کس لئے کھڑی ہیں؟ ان کے ووٹ سے کون سا وہ انقلاب آرہا ہے جو رسولؐ کو اس ملک میں مطلوب ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال، یہ ہے اس Brain-washing کا نتیجہ۔ پوری کی پوری امت ایک ایسے پروپیگنڈے کی زد میں ہے، ایک ایسے تماشے کی زد میں ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کی عقل دنگ ہے، حواس منجمد ہو گئے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ آپ ایک طرف لوگوں کی باتیں سنیں، مسلمانوں کے اہل دانش کی باتیں سنیں، دین اور شریعت کا علم رکھنے والوں کی باتیں سنیں اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسول کی بات سنیں تو آپ دیکھیں گے کہ اللہ اور رسول ایک سمت لے جانا چاہتا ہے تو مسلمانوں کے دانشور بالکل دوسری سمت پوری امت کو ہانک دینا چاہتے ہیں۔ اور دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ دیکھئے بات تو ٹھیک ہے یعنی یہ بات کہنا کہ اس ملک میں مسلمانوں کو ایک اسلامی ایجنڈے کے لئے کام کرنا چاہئے، ایک اسلامی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے سیاسی صف بندی کرنی چاہئے، بات تو سب ٹھیک ہے مگر یہ بات مصلحت کے خلاف ہے۔ اس سے بڑا فتنہ پیدا ہو جائے گا، اس سے بڑا ہنگامہ ہو جائے گا اس لئے ابھی اس ایجنڈے کو مؤخر کر دیا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ امت کے مصالح آپ بہتر سمجھتے ہیں یا اللہ اور اس کا رسول؟ تو قصہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ عقلمند اور دانا سمجھنے لگے ہیں۔

جب لاالٰہ کا پیغام مکہ کی وادیوں میں گونجا تو آپ نے دیکھا کہ مٹھی بھر مسلمانوں

پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ حالات اتنے خراب ہوگئے کہ ان کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینے میں جب ایک چھوٹی سی اسلامی کمیونٹی کا وجود عمل میں آتا ہے تو وہاں بھی مسلسل سازشیں ہیں، مسائل ہیں دو ڈھائی سو لوگ جو مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچے ہیں ان کی زندگی مسلسل مہم جوئی میں صرف ہو رہی ہے۔ اس وقت یہ سوال کیوں نہیں اٹھا کہ اے محمد تم یہ کون سا پیغام لے کر آئے ہو؟ تم یہ کون سی بات کہتے ہو کہ تمہارے ماننے والے مسائل میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان پر زندگی عذاب بن رہی ہے، انھیں گھر بار چھوڑنا پڑ رہا ہے تو ذرا اس پیغام کو Tone down کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ جب آپ کے چچا کے پاس قریش کا ایک وفد پہنچتا ہے، کہتا ہے کہ دیکھو تمہارے بھتیجے نے پوری سوسائٹی میں ایک انتشار کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ خاندان کے اندر باپ بیٹے کا دشمن ہو گیا ہے، بھائی بھائی کے خلاف تلوار نکال رہا ہے۔ سوسائٹی تہہ و بالا ہو گئی ہے تو ذرا ایسا کرو کہ ہمارے اور محمد کے درمیان ایک معاہدہ ہو جائے۔ وہ ذرا اپنے پیغام کو Tone down کر دیں۔ وہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں، وہ ہمیں کفار و مشرکین نہ سمجھیں۔ تو اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو محمد کو جو کچھ اسے مطلوب ہے ہم اسے دینے کو تیار ہیں اور مؤرخین نے اس واقعے کو نوٹ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب قریش کے اس وفد سے ابو طالب کی گفتگو ہو رہی تھی تو اس وقت رسول اللہ کو ایک لمحے کے لئے ایسا لگا کہ شاید آپ کے چچا اپنی حمایت کھینچنے والے ہیں۔ گویا آپ کے قدموں سے زمین نکلنے والی ہے۔ آپ آبدیدہ ہو گئے لیکن پھر بھی اس نازک لمحے میں آپ نے جو بات کہی وہ یہ تھی۔ " واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترك هذا الامر حتی یظهره الله او اهلك فيه ما ترکته " یہ ہمارے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند رکھ دیں جب بھی میں اس message کو Tone down نہیں کروں گا۔ اس پر کوئی Compromise نہیں ہو سکتا۔ تو یہ ہے آپ کا موقف۔ یعنی مسائل جتنے بھی سخت ہوں، حالات جتنے بھی خراب ہوں، اس پیغام سے یہ امت روگردانی نہیں کر سکتی۔ یہ ہمارا Committement ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے، ہم نے باقاعدہ بیعت کی ہے رسول اللہ سے۔ اب اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیمپ سے نکل کر ہم دوسروں کے کیمپ میں جانے لگے، دوسروں کے کام کرنے کے لئے عہد و پیمان ہونے لگے تو آپ سمجھ لیجئے کہ ہمارا تعلق آپؐ سے ٹوٹ گیا، ختم ہو گیا۔

اب اگر اس ملک میں مسلمان اس بات کے لئے تیار ہیں کہ وہ رسول اللہ سے

مسلمان پورا کا پورا بننے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کی پوری زندگی اسلام کی اتباع میں صرف ہو، شریعت اس ملک میں نافذ ہو، آپ کی زندگی پر نافذ ہو اور اس پورے نظام پر نافذ ہو۔ شریعت اس لئے نہیں آئی ہے کہ اس ملک میں آپ اسے پرسنل لا بنالیں، آپ اس کے تحفظ کی مہم چلائیں۔

ایک مسلم سیاسی پارٹی کا ڈول ڈالنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس موجودہ صورت حال میں جہاں مسلمانوں کی ایسی Brain-washing ہو گئی ہے کہ وہ مختلف قسم کی امتوں میں بٹ گیا ہے، اس کو ہم وہاں سے ان کیمپوں سے نکالیں اور رسول اکرمؐ کے ایجنڈے کے لئے دوبارہ تیاری کریں۔

اپنا تعلق توڑ لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر اس ملک میں ان کے اوپر جو پریشانیاں آرہی ہیں وہ یکسر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی ذاتی زندگی میں جتنا بھی گیا گزرا کیوں نہ ہو اس کی ایمانی حالت کتنی ہی تباہ کیوں نہ ہو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا یہ بات تو ان کفار و مشرکین کو معلوم ہے کہ رسول اکرم کے دامن کو مسلمان نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ بات تو ان سے کہلوانی مشکل ہے کہ تم محمدی قسم کے ہندو بن جاؤ لیکن یہ بات کہلانا شاید آسان ہو کہ تم سیکولر مسلمان بن جاؤ، لبرل مسلمان بن جاؤ، یا ذرا easy-going قسم کے مسلمان بن جاؤ، فنڈامنٹلسٹ نہ بنو۔ اور اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے دانشور اب اس ملک میں اس طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں کہ اس بین المذاہبی اور بین الملی ملک میں سیکولرازم ہی ایک بہتر option ہو سکتا ہے۔ اس ملک کے سب سے بڑے عالم نے یہ بات کہی کہ اس ملک کو صرف تین چیزیں متحد رکھ سکتی ہیں۔ عدم تشدد، سیکولرزم اور ڈیموکریسی اور پھر یہ بات بھی کہی کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے سیکولرزم کا فلسفہ ہی مناسب ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں کہنے والے نے یہ بات کہہ دی کہ رسول اللہ کی شریعت اس ملک میں relevant نہیں رہ گئی ہے۔ وہ اس صورت حال کے لئے ہدایت نہیں دیتی، اسے لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔ اس ایجنڈے کو سرد خانے میں ڈال دیجئے یہاں تو سیکولرازم ہی چل سکتا ہے

بات اس سے بھی آگے بڑھتی ہے اور ایک اعلان آتا ہے کہ یہ بات طے کرنا کہ اس ملک میں سیکولرزم چلے، اس ملک میں جمہوریت کو فروغ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فیصلہ تھا اس ملک کے لئے۔ ایک الہامی بات تھی اس لئے ہمیں اسے قبول کر لینا چاہئے۔ بات اس سے بھی آگے بڑھتی ہے اور ایک عالم دین آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس ملک میں دستور پر جو نظر ثانی کی بات ہو رہی ہے اس سے مسلمانوں کے لئے آخری پناہ گاہ بھی اب ختم ہو جائے گی، نعوذ باللہ۔ مسلمانوں کے لئے آخری پناہ گاہ ملک کا دستور نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے اللہ رب العزت کی پناہ گاہ کافی ہے۔ ان دستوری وعدوں سے، ان سیاسی پارٹیوں کی طفل تسلیوں سے آپ کا مستقبل اس ملک میں محفوظ نہیں ہے۔

جب کسی امت پر زوال آتا ہے، تو رفتہ رفتہ یہ ہوتا ہے کہ کل تک جو چیز ناقابل قبول تھی وہ قابل قبول بن جاتی ہے، پھر وہ ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہو جاتی ہے کہ ہم یہ محسوس نہیں کر پاتے کہ ہم کتنی بڑی معصیت میں مبتلا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب آج مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کی بات ہوتی ہے تو مسلمانوں کے پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں کہ بھئی مسلمانوں کی سیاسی پارٹی کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ مسلم سیاسی پارٹی

اس امت کا ہدف نہیں ہو سکتی، مسلم سیاسی پارٹی صرف ایک راستہ بنا سکتی ہے اس امت کو اس سیاسی قسم کے ارتداد سے نجات دلانے کے لئے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ورکرز جو مختلف سیاسی پارٹیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو ان کیمپوں سے نکال کر رسول اکرم کے سیاسی ایجنڈے کے لئے متحرک کیا جائے، رسول اکرم کا سیاسی قافلہ متحرک ہو، آپؐ کی شریعت اس ملک میں نافذ ہو۔ یہی مسلمانوں کا ایجنڈہ ہے، یہی سیاسی ایجنڈہ ہے، یہی مذہبی ایجنڈہ ہے اور یہی اس امت کا نصب العین ہے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ قرآن بہت صراحت کے ساتھ اس طرح کی باتیں کہتا ہے "یاایھا الذین آمنوا آمنوا" اللہ تعالیٰ کہتا ہے "ادخلوافی السلم کافۃ" کبھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان لوگوں نے جنھوں نے اپنی زندگی کو پوری طرح اسلامی خطوط پر منظم نہیں کیا وہ ایمان کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئٹ ھم الکافرون ان لوگوں نے جنھوں نے اپنی زندگی کے امور فیصل کرنے کے لئے اللہ کی ہدایت کو ٹھکرا دیا، اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ کافر ہوگئے، وہ فاسق ہوگئے، وہ ظالم ہوگئے۔ تو مسلمان پورا کا پورا بننے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کی پوری زندگی اسلام کی اتباع میں صرف ہو، شریعت اس ملک میں نافذ ہو، آپ کی زندگی پر نافذ ہو اور اس پورے نظام پر نافذ ہو۔ شریعت اس لئے نہیں آئی ہے کہ اس ملک میں آپ اسے پرسنل لا بنالیں، آپ اس کے تحفظ کی مہم چلائیں، نہیں۔

اور دیکھئے یہ شرعی موقف (Stand-point) ہے، اس پر فقہاء کا اجماع ہے کہ ہندوستان سابق دارالاسلام ہے۔ دارالاسلام کے لئے جو کم از کم شرط ہے وہ یہ کہ شریعت اس ملک میں نافذ رہی ہو اور یہ کہ جو خلافت کا ادارہ ہے اس سے وابستگی ہو اور ان دونوں شرائط پر ہزار سالہ مسلمانوں کی مختلف حکومتیں پوری اترتی ہیں۔ اس لئے ہم اسے سابق دارالاسلام کہتے ہیں۔ یہ اس کی شرعی حیثیت ہے اور یہ ایک بہت ہی مسلمہ بات ہے کہ جب کسی دارالاسلام میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے وہ سابق دارالاسلام بن جائے تو مسلمانوں کے لئے پھر کرنے کا کام کیا ہے؟ فقہاء کا اجماع ہے اس بات پر کہ صرف دو راستے ہیں مسلمانوں کے لئے، یا تو آپ ہجرت کر جائیں یا آپ اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے لئے جدوجہد کریں، کوئی تیسری راہ نہیں۔ تو مسلمانوں کا ایجنڈہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس سرزمین کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے لئے کام کریں۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دارالکفر میں شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ مسلمان دائمی سکونت اختیار کرلیں۔ تو اگر نئی بننے والی مسلم سیاسی پارٹی کی جدوجہد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دستوری، اقلیتی حقوق دلوادے گی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسول اللہ کے ایجنڈے سے انحراف ہوگا۔ ہم اس ملک میں اقلیت کی حیثیت سے رہنے کے لئے نہیں آئے۔ ہم اس ملک میں تحفظات کے حصول کے لئے زندہ نہیں ہیں۔ اگر کوئی سوچنے والا ایسا سوچتا ہے تو وہ رسول اللہ کے ایجنڈے سے واقف نہیں ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کا خواب کیسے سچ کر دکھایا جائے جب کہ صورت حال یہ ہے ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس ملک میں ہماری نجات سیکولر ڈیموکریسی کے راستے آرہی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ سیکولرزم کی جو بھی قسم ہو، آپ اسے جس قدر dilute کردیں مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ صرف اس مفہوم میں کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا یعنی ہمارے اپنے جو مسائل ہیں، جو اپنی مذہبی زندگی ہے، نماز روزے کی حد تک اس میں تو ہم اللہ اور رسول کی اتباع کریں گے اور بقیہ زندگی کفار و مشرکین کی شریعت کے مطابق گزاری جائے گی تو یہ انحراف ہے، ارتداد ہے۔

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ اللہ اور اس کے رسول کو مسجدوں کی دیواروں میں مقفل کردیں۔ بلکہ اس کا مطالبہ ہے کہ رسول اللہ کی شریعت کے مطابق پوری زندگی مرتب ہو، پورے کام انجام پائیں اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب اس ملک میں اسلامی نظام عدل قائم ہو اب اگر اس ملک میں کوئی ایسی پارٹی، کوئی ایسا گروہ یہ کام کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اسے یقیناً موجودہ صورت حال میں سے راستہ بنانا ہوگا۔ اور اس لئے ایک مسلم سیاسی پارٹی کا ڈول ڈالنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس موجودہ صورت حال میں جہاں مسلمانوں کی ایسی Brain-washing ہوگئی ہے کہ وہ مختلف قسم کی امتوں میں بٹ گیا ہے، اس کو ہم وہاں سے ان کیمپوں سے نکالیں اور رسول اکرم کے ایجنڈے کیے لئے دوبارہ تیار کریں اور اس کو متحرک کریں۔ اور اس کو یہ بتائیں کہ اسلام کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ آپ صرف نماز روزے کی ارتھمیٹک کے ذریعہ جنت میں جانے کا راستہ طے کرلیں۔ ہم کیسے مسلمان ہیں؟ رسول اللہ سے یہ ہماری کیسی محبت ہے؟ آپ کا دین مغلوب ہے، آپ کی امت زوال کا شکار ہے، پراگندہ ہے۔ کفار و مشرکین اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پوری دنیا میں اس کا حال خراب ہے اور ہم مطمئن اپنے ثواب و عذاب کی فکر میں تسبیح کے دانے کھٹ کھٹ گرا رہے ہیں، ثواب جمع کرنے میں لگے ہیں۔ آپ کو اپنی نجات کی پڑی ہے، آپ کو رسول اللہ کی امت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپؐ نے
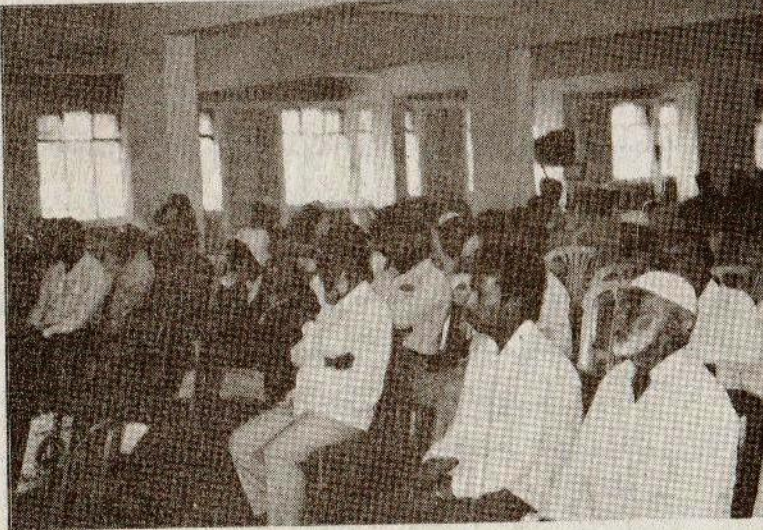
فرمایا کہ جس نے ہماری امت کی فکر نہیں کی وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جو امت کی فکر سے بے بہرہ ہے جو امت کے بارے میں متفکر نہیں ہے اس کا ایمان مشکوک ہے۔ پھر بڑے بڑے اہل تقویٰ کو دیکھئے کہ ان کی پوری کی پوری زندگی اس نظام کفر کی معصیت میں لت پت ہے۔ صرف نکاح، طلاق اور وراثت کا مسئلہ اسلام کے اصولوں کیے مطابق طے کیا جائے اور دنیا کے سارے مسائل غیر مسلموں کی اتباع کے لئے چھوڑ دیے جائیں۔ یہ اسلام کا پیغام نہیں ہے نہ یہ اسلام کو مطلوب ہے۔

اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ رسول اکرم کی امت نے عملی طور پر بیعت کر رکھی ہے مختلف کفار و مشرکین کے ہاتھوں پر۔ حتیٰ کہ ہماری مذہبی قیادت، بہ اشثنیٰ چند، نے بھی ان کفار و مشرکین کے ہاتھوں پر بیعت کر رکھی ہے۔ آپ کسی بڑے سے بڑے ملی لیڈر کا جائزہ لیجئے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا قائد ہے، محترم آدمی ہے۔ یہ مسلمانوں کا قائد ہے لیکن جب آپ اس کی انکوائری کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا قائد تو کوئی غیر مسلم ہے۔ لہٰذا الیکشن کے دنوں میں ہمارے پاس بڑے بڑے فتوے آتے ہیں اور مقتیان کرام کے اس پر دستخط موجود ہیں کہ وہ اس ملک میں سماجی انصاف کی جنگ لڑنے کے لئے ملائم سنگھ یادو کا ساتھ دیں۔ خدا کے بندو! تم ملائم سنگھ کی رہنمائی میں کون سی منزل سر کرنا چاہتے ہو؟ اور یہ حق تمیں کیسے حاصل ہو گیا کہ تم پوری امت کی قیادت کو ہائی جیک کر لو اور اسے کفار و مشرکین کے ہاتھوں میں دے دو؟ شرعی طور پر یہ صورت حال انتہائی ناقابل برداشت ہے، یہ کھلا کفر ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہمارے پاس نص قطعی موجود ہے کہ "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً" اللہ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا اور ہرگز اجازت نہیں دے گا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں پر حکمراں بن جائیں۔ اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے اسلامی شریعت میں کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کفار و مشرکین کو سامنے لے آیا جائے۔

آج عملی طور پر اس ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ ۲۵ کروڑ مسلمانوں کے اجتماعی زندگی کے مسائل کس طرح حل ہوتے ہیں؟ اس کی قیادت کون انجام دے رہا ہے؟ یہ کتنی افسوس ناک صورت حال ہے اور کتنی توہین ہے نبی عظیم کی کہ اس کی امت کفار و مشرکین کی غلامی کر رہی ہے، ان کی حاشیہ برداری میں مصروف ہے۔ اس سے بڑی ذلت اور اس سے بڑی رسوائی اور کیا ہوگی۔ تو یہ ہے وہ ارتداد جسے میں سیاسی ارتداد کہتا ہوں جو اس امت کے ساتھ اس ملک میں پیش آچکا ہے۔

ہم کیسے مسلمان ہیں؟ رسول اللہ سے یہ ہماری کیسی محبت ہے؟ آپ کا دین مغلوب ہے، آپ کی امت زوال کا شکار ہے، پراگندہ ہے۔ کفار و مشرکین اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پوری دنیا میں اس کا حال خراب ہے اور ہم مطمئن اپنے ثواب و عذاب کی فکر کرتے ہوئے تسبیح کے کھٹ کھٹ دانے گرا رہے ہیں۔

ہماری مائیں، بہنیں گھنٹوں قطار میں، چلچلاتی دھوپ میں، ٹھٹھرتی سردیوں میں کس لئے کھڑی ہیں؟ ان کے ووٹ سے کون سا وہ انقلاب آرہا ہے جو رسول کو اس ملک میں مطلوب ہیں۔

دیکھئے ایک عجیب مخمصہ ہے اس امت کے ساتھ، اس امت کے پاس ایک واضح پیغام ہے، ایک کلیر کٹ ایجنڈہ ہے۔ اس امت کے پاس قرآن ایک، رسول ایک، پیغام ایک سب کچھ ایک ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب مسلمانوں میں دین و شریعت کا علم رکھنے والے لوگ کسی مسئلے پر فیصلے کے لئے بیٹھتے ہیں تو وہ کسی ایک حل پر نہیں پہنچتے۔ آپ الیکشن کے موقع پر دیکھیں، مختلف مسلم گروہ، مختلف مسلم جماعتیں، مختلف مسلم قائدین، مختلف فتوے، مختلف قسم کے اعلانات لے کر میدان میں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان مسائل میں رہنمائی کے لئے ہم کتاب و سنت سے رجوع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اپنے دماغ کی اپج کافی ہے۔ اگر کتاب و سنت کو بنیاد بنایا جائے تو پھر اس میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ نص قطعی موجود ہے کہ کفار و مشرکین کو آپ اپنا حکمراں نہیں بنا سکتے۔ بات صاف ہو گئی کہ ان کے لئے ووٹنگ نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ بحث ہی ختم ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا مسیحا ملائم سنگھ ہے یا باجپئی۔ لالو پر سادیادو میں، کاشی رام میں یا سونیا گاندھی یہ بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ شریعت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان میں سے کسی کو ووٹ دیں۔ اس لئے کہ ووٹ دے کر ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ آپ ہمارے امور کی رہنمائی کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیجئے۔ ان کو پاور میں لاکر ان کو ووٹ دے کر ہم ایک گناہ عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایک Unpardonable Offence کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس کے باوجود ہم اپنی ذاتی زندگی میں سماجی زندگی میں مطمئن ہیں، یہ ایک بڑا حادثہ ہے اس امت کے ساتھ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب اس امت کے پاس کوئی لیڈر شپ نہیں ہے، اس کے پاس کوئی وژن vision نہیں ہے، کوئی ڈائرکشن (direction) نہیں ہے، کوئی سمت نہیں ہے تو ہو یہ رہا ہے کہ حادثات پر حادثات پیش آتے جا رہے ہیں۔ اس پر ضعف اور بے بسی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آپ دیکھیں کہ کچھ دنوں پہلے یہ قضیہ اٹھایا گیا کہ ندوۃ العلماء میں کشمیری دہشت گردوں نے پناہ لے لی ہے۔ حکومت نے ندوۃ پر ہاتھ ڈال دیا، مسلمان صرف اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ اس وقت کی حکومت نے ایک مسلم وزیر کو معافی تلافی کے لئے ندوۃ بھیج دیا، بات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ایک پروپیگنڈے کا سلسلہ ہے نیشنل میڈیا میں کہ سارے مدارس، مسلمانوں کے ادارے آئی ایس آئی کے اڈے ہیں۔ حیدر آباد کی مسجدوں کی تلاشی ہونے لگی کہ یہاں آئی ایس آئی کے لوگ چھپے بیٹھے ہیں۔ ہم خاموش رہے، ہم نے اس پر کوئی ری ایکشن نہیں کیا۔ ہم یہ سمجھتے رہے جیسے ہمارے اوپر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ ہر مدرسہ بلا اشثنیٰ حتیٰ کہ وہ دارالعلوم دیوبند ہی کیوں نہ ہو، وہاں بھی مہتمم حضرات کو صفائی دیتے دیتے حالت خراب ہو رہی ہے کہ ہمارے یہاں کوئی دہشت گرد

نہیں ہے، ہمارے یہاں کوئی بنگلہ دیشی نہیں ہے، پھر بھی ہم بڑے سکون سے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد پھر یہ مرحلہ آتا ہے کہ وہ چیزیں جو کہ ہمارے بنیادی عقائد سے ٹکراتی ہیں اس کو لادنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پچاس سالوں سے مسلمانوں نے وندے ماترم کے سلسلے میں جو کچھ بھی کہا جو کہ Constituant Assembly کی بحثوں میں ریکارڈ ہے۔ اس کے بعد وہ مسئلہ سرد ہوگیا، حل نہیں کیا مسلمانوں نے۔ لہٰذا وندے ماترم کے بعد اب ایک سرسوتی دیوی کی پوجا ان پر لادنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ رفتہ رفتہ آپ ایک ایک چیزوں کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ مختلف دینی مدارس میں یوم آزادی کے موقع پر مٹھائیوں کی تقسیم کا سلسلہ ہے۔ دینی مدارس کے آفاقی تصورات پر تنگ نظر وطن پرستی اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔ ایک بار جب آپ پیچھے ہٹتے جاتے ہیں تو مسلسل پسپائی کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو روکے نہیں رکتا۔ اور پھر یہ چیزیں عملی زندگی کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے ایک بحث کا آغاز کیا کہ دیکھئے وندے ماترم کا جہاں تک قصہ ہے وہ تو ایک غلیظ، مشرکانہ گیت ہے، اس کو مسلمان قبول نہیں کرسکتا اس لئے کہ مسلمانوں کے یہاں معبود اور وہ جس کے لئے سر جھکایا جائے، صرف رب العزت کی ذات ہے۔ رہی یہ بات کہ قومی ترانہ تو اس میں متن کے اعتبار سے کوئی خرابی نہیں ہے۔ وہ فی نفسہ رب العزت کا ہی ایک حمد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا مسلمانوں کو یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ کفار و مشرکین کے ساتھ صف میں کھڑے ہو کر اللہ رب العزت کی حمد کا نغمہ گائیں۔ اس پر کوئی debate نہیں ہوا۔ کوشش یہ کی گئی کہ اس سے دامن بچایا جائے اور جو لوگ دین و شریعت کا علم رکھتے تھے چونکہ ان کو اس صورت حال سے واسطہ نہیں تھا، وہ سرکاری ملازم نہیں تھے، انھیں جلسوں میں حاضری نہیں دینی ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ قومی نغمہ گانے اور جھنڈے کی سلامی کا واقعہ پیش نہیں آتا تھا لہٰذا وہ خاموش رہے۔ لیکن پوری امت کیا کرے؟ اس بارے میں وہ مخمصے کا شکار رہی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کو قبول کیا اور اب یہ چیز ہماری زندگی کا حصہ بنتی چلی گئی۔ تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ کوئی چیز اگر ہمارے بنیادی پیغام سے ٹکراتی ہے، اس پر ایک debate ہونی چاہئے۔ اس پر ایک موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف اس سے بات نہیں بنے گی کہ ہم چونکہ سرکاری نوکر نہیں ہیں اور کچھ لوگ نہیں ہیں تو وہ اس صورت حال سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ بتایا جائے کہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے تو مسلمان خوشی خوشی اس عمل میں شریک ہوں اور اگر نہیں دیتی ہے تو

پھر اس سلسلے میں ایک فیصلہ کن بات کی جائے۔ اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہم مسلمان اس ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے دست بازو نہیں بن سکتے اور ان کا جو خواب ہے، ان کا جو ایجنڈا ہے اس کے لئے کام نہیں کرسکتے تو سیدھی سی بات یہی ہوتی ہے کہ قرآن مجید ہم سے اس پورے ملک کو ایک دوسرے direction میں لے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دستور یہ چاہتا ہے کہ اس ملک میں آنے والے دنوں میں ایک یونیفارم سول کوڈ کا معاشرہ ہوجائے۔ یہ اس ملک کی حتمی منزل ہے۔ یعنی یہ وہی بات ہے جو گاندھی نے کہی تھی کہ:

"I swear by my religion, I will die for it. But it is my personal affair. The State has nothing to do with it."

گاندھی کے لیے تو یہ بات ممکن تھی لیکن مسلمانوں کے لئے دین Private معاملہ نہیں ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہوا یہ کہ اس ملک کی تقسیم سے پہلے ان لوگوں نے بھی جنھوں نے دین و شریعت کے نام پر اس ملک کو بانٹا، خود ان کے پاس بھی نظام اسلامی کا کوئی خاکہ نہیں تھا لہٰذا آپ دیکھیں تو حیرت محسوس ہوتی ہے کہ جناح کے بیان اور گاندھی کے بیان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ گاندھی کہتا ہے کہ religion ہمارا ذاتی معاملہ ہے، اس کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جناح صاحب کا بھی یہی موقف ہے:

You may belong to any religion, or caste, or creed - that has nothing to do with the business of the State.

دیکھا جائے تو وہ لوگ جو اسلام اور شریعت کے نام پر ایک ملک کا مطالبہ کر رہے تھے ان کے پاس بھی کوئی vision نہیں تھا کہ وہ کوئی اسلامی خلافت قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا آج ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے جب یہ بات کی جاتی ہے کہ ایک مسلم سیاسی پارٹی کا وجود عمل میں آئے، اس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے کام کیا جائے تو وہ پڑوسی ملک کی مثال دیتے ہیں کہ وہاں تو مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں تو شریعت نافذ نہیں ہو رہی ہے۔ آپ کیسے توقع کرتے ہیں کہ یہاں نافذ ہوجائے گی؟ میں کہتا ہوں کہ شریعت کے نفاذ کا تعلق اکثریت اور اقلیت کی اصطلاح سے نہیں ہے۔ اسلام ایسی کوئی فقہ مرتب نہیں کرتا جس میں مسلمان خوشی خوشی ایک غیر اسلامی نظام میں اقلیت کی حیثیت سے رہ سکیں۔ اور فقہی ارتقاء میں ایسا کوئی مرحلہ نہیں آیا جب miniority situation کے لئے کوئی فقہ دریافت کرلی گئی ہو۔ لہٰذا اس بات سے دھوکہ نہ کھائیے کہ پڑوسی ملک

پاکستان میں تجربہ ناکام کیوں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام اقتدار آئی تھی وہ اس بات کا کوئی شعور ہی نہیں رکھتے تھے کہ انھیں کرنا کیا تھا۔ وہ بھی ایک بے دین معاشرہ، سیکولر اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے اور یہاں کے لوگ بھی وہی کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہمارے کے لئے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بھی ایک اسٹیٹ آف کفر ہے وہ بھی دوسرا اسٹیٹ آف کفر ہے۔ جب تک کہ وہاں شریعت نافذ نہیں ہوجاتی اور یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی کہ " ان الحکم الا للہ "حکم تو صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ہے۔ پاکستان کے ساتھ یہی حادثہ ہوا کہ بالکل ابتدائی مرحلے میں ان کے چوٹی کے لوگ جو لبرل قسم کے سیکولرسٹ تھے، قادیانی تھے یعنی ایک ملغوبہ تھا جن کو اسلام اور دین سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ جمع ہوگئے لیکن مسلمانوں کو exploite کیا گیا اللہ کے نام پر اس کے دین کے نام پر پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ۔ اس نام پر انھوں نے ایک ملک حاصل کیا۔ یہ بات بھی آپ کو معلوم رہے کہ شرعی طور پر خود پاکستان کی تحریک صحیح نہیں تھی اس لئے کہ دارالاسلام کے ایک حصے کو حاصل کرنے کے لئے دارالاسلام کے دوسرے حصے کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک غلط فیصلہ تھا۔ اب اس وقت ہندوستانی مسلمان جس صورت حال میں گھرے ہیں ایسا ان کی بہت سی پرانی غلطیوں کی وجہ سے ہے۔

مسلم سیاسی پارٹی قائم کرکے مسلم سیاسی پارٹی میں شامل ہوکر ہم کچھ اور کرسکیں یا نہ کرسکیں، لیکن کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہم اپنی ایمانی زندگی درست کرلیں گے۔ ہم غیر مسلموں کی بیعت سے نکل کر دوبارہ رسول اللہ کی بیعت میں آجائیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ فی نفسہ ایک بہت بڑا اعزاز ہوگا کہ اگر رسول اللہ کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے ہماری زندگی کا چراغ گل ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں ایک اعزاز ہے۔ اس کے لئے آپ کے پاس ایک انعام ہے آخرت میں۔ لیکن اگر کفار و مشرکین کے لئے آپ نے اپنی زندگی ضائع کی تو میں سمجھتا ہوں دنیا کا بھی نقصان ہے اور آخرت کا بھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس پورے Process میں آپ کو کچھ نہیں مل سکتا۔ رہے وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری باتوں سے ان کے لئے مسائل پیدا ہوجائیں گے، مسلمانوں میں ایسے لوگ ایسے قائدین موجود ہیں جو اس ایجنڈے کو کہتے ہیں ذرا ٹھنڈا کرو اور بعض لوگ مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اوچھی ترکیبیں ہوتی ہیں۔ ایسی کوششیں کی جاتی ہیں کہ ملی پارلیامنٹ کا یہ قافلہ مسلم سیاسی پارٹی کی یہ دعوت مختلف شہروں میں داخل ہونے سے رک جائے تو میں ان سے مخلصانہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ بھائیو ہم جیسے بھی ہوں ہمارا آپ سے ایک دینی تعلق ہے، ہم آپ کے اپنے ہیں اور یہ کفار و مشرکین آپ سے جتنی بھی بہی خواہی کی بات کیوں نہ کریں یہ آپ کے نہیں ہوسکتے۔

وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی سیاسی زندگی کو تنظیم نو کے لئے، اپنی سیاسی صف بندی

شرعی طور پر خود پاکستان کی تحریک صحیح نہیں تھی اس لئے کہ ایک حصے کو حاصل کرنے کے لئے دارالاسلام کے دوسرے حصے کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔

مسلم سیاسی پارٹی قائم کرکے مسلم سیاسی پارٹی میں شامل ہوکر ہم کچھ اور کرسکیں یا نہ کرسکیں، لیکن کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہم اپنی ایمانی زندگی درست کرلیں گے۔ ہم غیر مسلموں کی بیعت سے نکل کر دوبارہ رسول اللہؐ کی بیعت میں آجائیں گے

کے لئے اب ایک فورم تشکیل دیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ملی پارلیامنٹ نے اس سلسلے کا ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جو پچھلے پچاس سالوں میں اس ملک میں نہیں اٹھ سکا تھا۔ رسول اکرم کے ایجنڈے کو دوبارہ سرگرم کرنے کے لئے اس ملک میں پچھلے پچاس سالوں میں سیاسی فرنٹ پر نظری اعتبار سے یہ پہلی کوشش ہورہی ہے۔ مجھے اندازہ ہے میں مختلف شہروں میں گیا، مختلف جگہوں پر میں نے اجلاس منعقد کئے، مسلمانوں کو یہ بات سمجھانے میں ہمیں بہت دشواری پیش آرہی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ لیکن میں دل شکستہ نہیں ہوں، ہیں میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑا سا وقت لگے گا۔ یعنی پچاس سال کی Brain wahsing کو آپ اتنی آسانی سے ختم نہیں کرسکتے، وقت تو ضرور لگے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ مختلف سیاسی پارٹی کو آزماتے رہے، ان کی جھولیوں میں اپنے ووٹ ڈالتے رہے تو وہ آپ کو کہیں نہیں لے جاتے۔ آپ پر سیاسی غلامی کے سائے مزید گہرے ہوتے جائیں گے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ملی پارلیامنٹ کی اس دعوت پر سعید روحوں میں جوش و جذبہ پیدا ہو اور عمل کی طرف آمادگی ہو۔

دیکھئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کسی ایسی دعوت پر لوگوں کی بڑی تعداد ابتدائی مرحلے میں متحرک ہوتی ہے یا نہیں، انقلابی تحریکوں کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جب رسول اکرم کو جب کہ آپ کی ذات مبارکہ خود موجود تھی اس سرزمین پر ۱۳ سال کے عرصے میں صرف ڈھائی تین سو لوگوں کا قافلہ مل سکتا ہے تو آپ غور کریں ان کے امتیوں کے لئے جن کی ایمانی زندگی تباہ ہے، جن کا قافلہ لٹا پٹا ہے ان کے لئے یہ کام کتنا مشکل ہوگا۔ البتہ ہمیں ایک سہولت یہ ہے کہ آج رسول اکرم کی نیابت کا دعویٰ کرنے والی ایک بڑی امت اس ملک میں پہلے سے موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے دل پر دستک دی جائے۔ ضرورت ہے کہ اس سے کہا جائے کہ آئیے! رسول اکرمؐ کے کارواں کی تشکیل نو میں ہمارا ہاتھ بٹائیے، ہمارے ساتھ ہوجائیے اور اس وقت تک ہمارے ساتھ رہئے جب تک ہم آپ کے ایجنڈے کو لے کر آگے چلتے ہوں۔ اور اگر کہیں انحراف ہو تو ہمیں درست کرنے کی کوشش کیجئے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہم لوگوں میں وہ ہمت، وہ حوصلہ پیدا کرے اور جو کفر کی ہمالیائی طاقت ہے اس سے ہم خوف نہ کھائیں۔ ہمارے دلوں میں یہ جو خوف ہے کہ پتہ نہیں کیا ہوجائے گا؟ کسی ایسی بات کے کہنے سے کفار و مشرکین کے درمیان ایک ہلچل برپا ہوجائے گی اور پھر ہمارے لئے محفوظ رہنا مشکل ہوجائے گا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس خوف سے نجات دے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو اپنی عافیت میں، اپنی امان میں لے لے۔

عراق پر امریکی حملہ پوری امت پر حملہ ہے

خلیج میں امریکہ کے خطرناک منصوبوں سے پردہ اٹھاتی ہوئی ایک اہم تحریر

عراق پر حالیہ امریکی حملے نے مسلم دنیا کی سلامتی کے سلسلے میں سوالیہ نشان پیدا کر دیا ہے، گویا یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مسلمان فرد ہو یا گروہ، بن لادن جیسا اکیلا، نہتا پناہ گزیں ہو یا سوڈان، عراق اور افغانستان جیسی کمزور حکومتیں ہر کوئی اس وقت عالمی نظام کفر کے رحم و کرم پر ہے جس کی رہنمائی امریکہ کر رہا ہے اور جس کی قیادت عظمیٰ پر بل کلنٹن جیسا بدنام زمانہ، اخلاق باختہ شخص فائز ہے۔ گویا اس وقت پوری دنیا ایک زانی، شرابی اور روحانی طور پر دیوالیہ شخص کے ہاتھ میں ہے اور ظاہر ہے جب عالمی قیادت پر ایک بدترین شخص فائز ہو تو پوری دنیا کے لئے فساد کی آماجگاہ بن جانا عین فطری ہے۔

دنیا کی تاریخ میں یہ صورت حال پہلی بار پیش آرہی ہے کہ مسلم ممالک پر اور اسلام کی مرکزی سرزمینوں پر اسلام دشمن طاقتیں جب چاہتی ہیں حملے کر ڈالتی ہیں۔ پوری دنیا کے مسلمان انتہائی بے بسی اور محرومی کے ساتھ اس تماشے کو دیکھتے ہیں۔ حکمراں ہوں یا علماء اس صورتحال پر ان کے دل تو یقیناً دکھتے ہیں لیکن امت مسلمہ کی محرومی کے ازالے کے اٹھ کھڑے ہونے کی عمومی صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہو رہا ہے کہ مسلم دنیا کسی واقعی قیادت سے محروم ہے۔ امت کا امیر گذشتہ پون صدی سے سیاسی منظرنامے سے غائب ہے، خلافت کا عہدہ خالی ہونے کی وجہ سے اب اسلام دشمن طاقتوں کے لئے یہ سب کچھ بہت آسان ہے کہ وہ جب چاہے مسلم دنیا کے کسی علاقے پر ہلہ بول دے، سینکڑوں لوگ اس وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں مارے جائیں، شہر کے شہر تباہ ہو جائیں، اس صورت حال کا ان سے حساب لینے والا کوئی نہیں۔ ظاہر ہے جب امت کسی نگہباں سے خالی ہو اور اس کی سیاسی قیادت منتشر ہو چکی ہو تو اس انتشار کے عالم میں چند حکمرانوں کی مذمت اور امریکی مخالف نعرے اس صورت حال کو بدل ڈالنے کے لئے کافی نہیں ہوتے۔ عراق پر امریکہ کے حالیہ حملے کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیئے۔

عراق اور امریکہ کی لڑائی میں یہ بات تو صاف ہے کہ نہ تو امریکہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے لڑ رہا ہے اور نہ ہی صدام حسین کو مسلم مفاد کا نگہبان کہا جاسکتا ہے۔ البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس پورے تماشے میں بم مسلمانوں کی سرزمین میں گر رہے ہیں اور تباہی مسلمانوں کے حصے میں آرہی ہے۔ جو لوگ صدام حسین کی پچھلی زندگی سے واقف ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ اقتدار کی بلند سیڑھیوں میں صدام حسین کو تعاون کہاں سے ملتا رہا ہے۔ خلیج کے چند عرب حکمرانوں مثلاً شام کے حافظ الاسد، فلسطین کے یاسر عرفات اور اردن کے شاہ حسین کی طرح صدام حسین بھی غیر ملکی آقاؤں کی حفاظت میں پلتے رہے ہیں۔ بعث پارٹی کی پوری تاریخ اسلام اور مسلمانوں کو دیس نکالا دینے کی رہی ہے گو کہ ایک مرحلے میں شام میں بغاوت کے لئے صدام حسین نے مسلم انقلابیوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی مسلم انقلابی ان کے اصل ارادوں سے واقف ہو گئے۔ صدام حسین کے دامن پر عراق ایران کی آٹھ سالہ جنگ کا خون بھی ہے جس میں عراق کی معیشت تباہ ہوئی۔ چنانچہ ۹۰ بلین ڈالر کا قرضہ عراقی حکومت کے حصے میں آیا۔ امریکی اشارے پر صدام نے کویت پر چڑھائی کر دی جس سے خطے میں زبردست بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پڑوسی مسلم ریاستیں اس صورت حال سے اس قدر خوفزدہ ہو گئیں کہ انھوں نے عراقی جارحیت کو روکنے کے لئے امریکہ اور دوسرے اسلام دشمن ملکوں سے مدد کی اپیل کی۔ جنگ کے خاتمے پر ہر جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ہاری ہوئی قیادت اقتدار پر اپنا کنٹرول برقرار نہیں رکھ پاتی ہے لیکن صدام حسین کا معاملہ اس کے برعکس رہا۔ امریکی اس بات کا خواہ کتنا ہی پروپیگنڈہ کریں کہ وہ صدام حسین کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر قیمت پر صدام حسین کے اقتدار کو طول دینا چاہتے ہیں اس لئے کہ اگر کوئی نئی قیادت عراق میں اقتدار سنبھال لیتی ہے تو پرانی امریکی اسکیمیں کارگر نہیں رہ پائیں گی۔ امریکی

صدر صدام حسین کی خوفناک تصویر پیش کرکے بار بار عراق پر حملے کا جواز کس طرح ڈھونڈھ پائیں گے، پھر یہ کہ نئی قیادت نئے سرے سے ملک کی تعمیر نو کے لئے پروگرام بنائے گی، پڑوسیوں سے تعلقات استوار کرے گی اور ماضی کی غلطیوں کے لئے صدام کو قصوروار ٹھہرا کر مسلم ملکوں سے یہ کہہ سکے گی کہ وہ اسلامی بنیادوں پر عراق کی تعمیر نو میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ البتہ جب تک صدام کی ذات موجود ہے کسی نئے رویے کی شروعات ممکن نہیں، اس لئے اسلام دشمن امریکی اور یوروپی ممالک چاہتے ہیں کہ صدام حسین کی خونخوار تصویر جو دنیا کے سامنے پیش کی گئی ہے اسے جوں کا توں باقی رکھا جائے تاکہ خلیج میں امریکی فوجیوں کی موجودگی کا جواز فراہم ہوتا رہے اور دنیا کو بتایا جاسکے کہ صدام حسین سے تیل کے ذخائر کو خطرہ ہے اس لئے مغرب اس کی حفاظت کے لئے اپنی فوجی کاروائی جاری رکھے ہوئے ہے۔

دیکھا جائے تو صدام حسین کی ذات سے اب تک اس امت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا مقابلہ کسی اور شخص سے نہیں کیا جاسکتا۔ گو کہ خلیج کے دوسرے حکمرانوں پر بھی یہ الزام ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی باہمی جنگ میں کفار و مشرکین کو مداخلت کی دعوت دی لیکن صورت حال کچھ ایسی بن گئی تھی کہ شاید ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ بہر حال جنگ خلیج ختم ہوئے کوئی آٹھ سال ہو چکے ہیں، اس دوران عراق میں نہ تو اب اتنی قوت ہے کہ وہ اب کسی پر حملہ کر سکے اور نہ ہی فی الواقع صدام حسین اس پوزیشن میں ہیں۔ پھر یہ کہ آٹھ سالہ معاشی پابندیوں کی وجہ سے عراق قحط جیسی صورت حال سے دوچار ہے۔ بنیادی ضروریات کی چیزیں اور ادویات کی کمی سے لوگوں کی موت واقع ہو رہی ہے۔ حکمراں ٹولے کا تو کچھ نہیں بگڑ تا کہ اس کے شب و روز سکون و اطمینان کے گزر رہے ہیں۔ صدام کو ملک کے اندر سے کوئی ایسا چیلنج نہیں ہے ایسا اس لئے کہ مغرب ہر قیمت پر موجودہ سیاسی ٹولے کو اقتدار میں رکھنا چاہتا ہے۔ البتہ اس صورت حال سے عراق کے مسلم عوام سخت پریشان ہیں پھر یہ کہ صدام حسین آج ہیں کل چلے جائیں گے، خلیج کے مسلم حکمرانوں کو سوچنا چاہئے کہ عراق کی جنگی صلاحیت امت کا اجتماعی سرمایہ ہے۔ کل ایک اگر نئی صالح قیادت عراق میں ابھرتی ہے تو یہ سب کچھ اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں استعمال ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے عراق میں واقع جنگی ٹھکانوں کو تباہ کروادیا تو کل جب کفار و مشرکین سے ہماری براہ راست جنگ ہوگی یا جب اسرائیل سے دو دو ہاتھ کرنے کا وقت آئے گا تو اس وقت ہمیں عراق کی اہم سرزمین سے کوئی مدد نہ مل پائے گی، اس لئے صدام حسین کی دشمنی میں ایسا نہ ہو کہ ہم امت کی ان قوت گاہوں کو ختم کردیں جہاں سے کل ہمیں دشمن کے مقابلے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس وقت پوری دنیا ایک زانی، شرابی اور روحانی طور پر دیوالیہ شخص کے ہاتھ میں ہے اور ظاہر ہے جب عالمی قیادت پر ایک بدترین شخص فائز ہو تو پوری دنیا کے لئے فساد کی آماجگاہ بن جانا عین فطرت ہے۔

اگر اس وقت ہم نے عراق میں واقع جنگی ٹھکانوں کو تباہ کروادیا تو کل جب کفار و مشرکین سے ہماری براہ راست جنگ ہوگی یا جب اسرائیل سے دو دو ہاتھ کرنے کا وقت آئے گا تو اس وقت ہمیں عراق کی اہم سرزمین سے کوئی مدد نہ مل پائے گی

خلیج میں امریکہ ایک نئی اسکیم کی عمل درآمد پر سوچ رہا ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں صدام حسین کو جنگی مجرم کی حیثیت سے پیش کئے جانے کی بات بھی سامنے آئی تھی، اور گذشتہ ماہ امریکہ نے اس بات کا بھی اعلان کیا تھا کہ وہ صدام حسین کو بے دخل کرنے کے لئے ان کے مخالفین کو ستانوے ملین ڈالر کی مدد دے سکتا ہے۔ حالانکہ امریکہ کی اسکیم نہ تو صدام حسین کا انخلا ہے اور نہ ہی وہ چاہتا ہے کہ اسلحوں سے پاک ایک پرسکون عراق وجود میں آئے بلکہ اس کے ارادے بہت ہی خطرناک ہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ عراق کو تین حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ شیعوں پر مشتمل ایک حکومت سعودی عرب کے قریب قائم کردی جائے جو مسلسل سعودی عرب کے لئے دردسر بنی رہے۔ دوسری طرف کردوں کی ایک ریاست ترکی کے سرحدی علاقوں میں قائم ہو جائے تاکہ ترکی اور نئے کردستان میں مسلسل جنگ کی سی کیفیت رہا کرے۔ رہ گیا عراق کا تیسرا حصہ جو عام سنی عراقیوں پر مشتمل ہوگا تو یہ ایران کی سرحد کے قریب ایرانی حکومت کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہوگا، اور جب تک یہ اسکیم پوری نہ ہو جائے امریکہ چاہتا ہے کہ عراق میں بعثی ٹولے کی حکومت بنی رہے اور صدام حسین اسی طرح مغرب کو خالی خول دھمکیوں سے مسلسل دعوت جنگ دیتے رہیں۔ صدام حسین کے علاوہ دوسرا کوئی اس کام کو اس خوش اسلوبی سے شاید انجام دے سکے اس لئے یہ بات امریکی مفاد میں ہے کہ ان کا اقتدار قائم رہے۔ رہی بات امریکہ کی مخالفین کی مدد کے لیے ستانوے ملین ڈالر کا جو بجٹ مختص کیا ہے تو اس کا مقصد بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ دیکھا جاسکے کہ کون لوگ اس پیسے کو لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور واقعی ان کی قوت کیا ہے؟ گذشتہ دنوں صدام حسین کے مخالفین نے لندن میں مظاہرہ کیا تو امریکیوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ مظاہرین آپس میں کتنے منتشر اور مختصر ہیں اور ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جن کو عراق کے اندر کوئی جانتا بھی نہیں۔

امریکہ صرف عراق کو تقسیم نہیں کرنا چاہتا بلکہ گذشتہ سال امریکیوں نے

تو آل سعود کی "تنگ نظری" سے تنگ آکر یہ منصوبہ بھی بنالیا تھا کہ وہ انہیں حرمین شریفین کی خدمت سے سبکدوش کر دے گا، اندرون خانہ سعودی عرب کی تقسیم کا مذموم منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لئے شاہ حسین کو تیار کیا گیا اور یہ ناپاک اسکیم بنائی گئی کہ حجاز مقدس کو سعودی عرب سے الگ کر کے شاہ حسین کی تحویل میں دے دیا جائے اور انہیں شریف مکہ کی حیثیت سے حجاز میں لابٹھایا جائے، لیکن وہ تو کہئے کہ شریف حسین کو اسی دوران ناقابل علاج مرض نے آلیا اور وہ امریکی ہاسپٹل میں زندگی کے بقیہ دن گننے لگے اس لئے اس اسکیم کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ پھر یہ کہ سعودی عرب کی تقسیم کے لئے امریکی گذشتہ سال موسم بہار میں جو پلان بنا رہے تھے وہ اس لئے بھی زیر عمل آنے سے رہ گیا کہ جب عراق پر حملے کی بات سوچی گئی تو خطے کے تمام عرب حکمرانوں نے اس اسکیم کی مخالفت کی۔ تب امریکا کو ایسا لگا کہ شاید ابھی اس کاروائی کے لئے وقت نہیں آیا ہے۔

البتہ ابھی یہ کہا جانا قبل از وقت ہے کہ امریکہ نے اس اسکیم کو ہمیشہ کے لئے سرد خانے میں ڈال دیا ہے یا وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ البتہ اتنی بات تو وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر اب مسلم حکمراں اور عوام دنیا کو کفر کی قیادت سے نجات دلانے کے لئے حرکت میں نہ آئے تو ان کی سرزمینیں محفوظ نہیں رہ پائیں گی۔ ▭

کیا اب فلسطینی مسلمانوں پر صبح کبھی طلوع نہ ہوگی؟

یاسر عرفات امریکی صہیونی ایجنڈے کے لئے کام کرنے پر بخوشی آمادہ ہو گئے ہیں

گذشتہ ماہ جب امریکی صدر بل کلنٹن فلسطین کے دورے پر پہنچے تو فلسطین کے بوڑھے اور بچے سبھی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ چھ سالہ مصطفیٰ کہتا تھا کہ کلنٹن اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بکس لایا ہے جو روپیوں سے بھرا ہے وہ جاتے جاتے ہم لوگوں کو بہت سا پیسہ دے جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہمیں فلسطینی ریاست دلانے کے لئے آرہا ہے۔ بچے ہی نہیں بوڑھے بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ کلنٹن کا دورہ فلسطینیوں کے حق میں مفید ثابت ہوگا لیکن اب کلنٹن کے جانے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اپنے اس دورے میں کلنٹن نے اگر کچھ کیا تو اس کا فائدہ صرف اسرائیل کو پہنچے گا۔ فلسطینیوں کو وہ کچھ دینے کے بجائے وہ بہت کچھ ان سے لے گیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ ایک آزاد ریاست فلسطین کا خواب فلسطینیوں سے چھن گیا حتی کہ تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) بھی اس بات پر آمادہ ہوگئی کہ وہ اپنے چارٹر سے وہ دفعہ ختم کر دے گی جس میں ریاست اسرائیل کو ختم کرنے کا عزم کیا گیا ہے۔

۱۹۶۴ء میں پی ایل او نے آزادی فلسطین کے لئے جو چارٹر تیار کیا تھا اس میں اس بات کا عہد کیا گیا تھا کہ فلسطینی، ریاست اسرائیل کے وجود کو ناجائز سمجھتے ہیں اور اس لیے اس ریاست کی مکمل تباہی کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں۔ گو کہ اوسلو معاہدے میں اس بات کی وضاحت کردی گئی تھی کہ اس معاہدے کے بعد پی ایل او چارٹر کی متعلقہ دفعات کالعدم ہو جائیں گی لیکن اسرائیل کا اصرار ہے کہ فلسطینی اپنے ہاتھوں سے اس دفعہ کو مٹادیں اور علی الاعلان اس بات کا اظہار کریں کہ وہ ریاست اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ بجادینے والے عزم سے باز آتے ہیں۔ کلنٹن نے اپنے اس دورے میں یاسر

عرفات کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ نہ صرف اپنے سابقہ عزائم سے بے زاری کا اعلان کریں گے بلکہ اسرائیل کو فلسطینیوں سے جو بھی شکایت ہے اس کے تدارک کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ دریں اثناء دمشق میں بعض پرانے فلسطینی رہنماؤں نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ صرف یاسر عرفات کو فلسطینی ایجنڈا متعین کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا لیکن اس وقت یاسر عرفات اپنی حکومت کو بچانے کے لئے چونکہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اس لیے پی ایل او کے چارٹر میں بنیادی تبدیلی ان کے لئے کچھ مشکل نہ ہوگی۔

دیکھا جائے تو امن کے نام پر امریکہ اور اسرائیل مسلسل فلسطینیوں کو ذلیل کررہے ہیں۔ کل تک جو کام اسرائیلی حکومت مشکل سے کرپاتی تھی اور جن فلسطینی نوجوانوں کو قابو میں کرنا حکومت اسرائیل کے لئے مشکل تھا اب یہ کام یاسر عرفات کو تفویض کردیا گیا ہے۔ اب یہ یاسر عرفات کی ذمہ داری ہے کہ وہ فلسطینی انقلابیوں کو سنبھالے رکھیں تاکہ ان سے ریاست اسرائیل کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اس سلسلے میں ۲۳/اکتوبر کو جو معاہدہ ہوا تھا اس کے نتائج دو دن بعد ہی سامنے آگئے۔ فلسطینی پولیس نے غیرلائسنس یافتہ اسلحوں کی ضبطی کے لئے جو مہم چلائی اس میں فلسطینی پولیس کے ہاتھوں ایک فلسطینی نوجوان وسیم طریفی مارا گیا اور پھر رملا کی سڑکوں پر احتجاج، مظاہروں، بند دکانوں اور جابجا جلتے ہوئے ٹائر کا وہی منظر دیکھنے میں آیا جس سے انتفاضہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ پھر دو دنوں بعد فلسطینی پولیس نے ان دو فلسطینیوں کو گرفتار کرلیا جن پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے ہیبرون میں آبادکار یہودیوں پر حملہ کیا تھا۔ اسرائیلی پولیس ان لوگوں کی تلاش میں پہلے سے تھی لیکن جو کام وہ اب تک نہ کرسکے تھے اسے یاسر عرفات کی پولیس نے انجام دے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن اس معاہدے پر دستخط ہوئے اسی دن دس فلسطینی صحافیوں کو صرف اس جرم میں گرفتار کرلیا گیا کہ وہ اس معاہدے کے بارے میں حماس کے روحانی قائد شیخ احمد لیسین کی رائے جاننا چاہتے تھے۔ یاسر عرفات کی حکومت کو یہ بھی گوارہ نہیں کہ مخالفین کی رائے منظر عام پر آئے حتیٰ کہ شیخ حمد جو عرفات کی حکومت میں وزارت اسلامی سے وابستہ ہیں، انھوں نے جب اس معاہدے کو قطری ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے امت سے غداری کے مترادف بتایا تو انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اس معاہدے میں یاسر عرفات کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ ریاست اسرائیل کے خلاف کام کرنے والے ہر گروہ، انجمن یا فرد کو سختی سے کچل ڈالیں۔ اس معاہدے پر دستخط کرتے وقت جو تقریب منعقد ہوئی اس موقع پر یاسر عرفات نے نیتن یاہو سے برملا کہا کہ آپ کا تحفظ ہمارا تحفظ ہے۔ مسٹر عرفات اس بات پر بھی آمادہ ہوگئے ہیں کہ وہ ان تیس فلسطینیوں کو فوری طور پر گرفتار کرلیں گے جن سے اسرائیل کو خطرہ ہے اور اس معاملے کی نگرانی سی آئی

اگر بعض لوگوں کو امن کے راستے کامیابی کا امکان دکھائی دیتا ہے یا جو لوگ عیسائی حکمراں بل کلنٹن اور یہودی حکمراں نیتن یاہو سے اب بھی دست تعاون بڑھانے پر مصر ہیں تو انھیں جان لینا چاہئے کہ ان کے ہاتھ آخر میں یاس وحسرت کے علاوہ کچھ بھی نہ آئے گا

اے انجام دے گی۔ ایک طرف تو فلسطینیوں پر یاسر عرفات کا عتاب تیز ہوجائے گا دوسری طرف اسرائیلی حکومت اپنے انتہاپسندوں کو پورا موقع دے گی کہ وہ فلسطینیوں کی زندگی سے کھیلیں۔ ابھی پچھلے دنوں اسرائیلی حکومت نے ایک ایسے شخص کو نظربندی سے رہائی دی ہے جسے سولہ فلسطینی نوجوانوں کے قتل میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس وقت کے ساڑھے تین ہزار فلسطینی مسلمان اسرائیلی جیل میں ہیں۔ اس معاہدے کے مطابق صرف ساڑھے سات سو لوگوں کو رہا کیا جائے گا۔ فلسطینی سیکوریٹی عملے میں سے بارہ ہزار لوگوں کو خارج کردیا جائے گا جس سے بہت سے فلسطینی خاندان متاثر ہوں گے۔

فلسطینی ریاست کہنے کو تو خود مختاری کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن عملاً یہاں ہر کام امریکی خفیہ تنظیم سی آئی اے کی رہنمائی میں انجام پارہا ہے۔ یاسر عرفات جو کبھی خود انقلابی سمجھے جاتے تھے اب انقلابیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔ نئے معاہدہ امن کے مطابق فلسطینی اور امریکی عہدہ داروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ خطہ فلسطین سے انقلابیوں کے ٹھکانوں کو ختم کردے۔ اس کمیٹی کی نگرانی کا کام بھی سی آئی اے کو سونپا گیا ہے جو ہر دو ہفتہ کے بعد اس بارے میں اٹھائے جانے والے اقدامات کا جائزہ لے گی۔ امریکہ نے غیر قانونی اسلحوں کو ضبط کرنے میں فلسطینی حکومت کو تعاون میں یقین دلایا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو فلسطینی پولیس کے ذریعے امریکہ مسلم انقلابیوں کو نیست و نابود کرنے پر تلا بیٹھا ہے اور چونکہ اب یہ کام اسرائیلی حکومت کے ذریعے نہیں بلکہ فلسطینی پولیس کے ذریعے انجام پارہا ہے اس لیے اس پر دنیا بھر میں رائے عامہ کی مخالفت کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ امن کے راستے فلسطین کی بازیابی کا خواب ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ پھر بھی اگر بعض لوگوں کو امن کے راستے کامیابی کا امکان دکھائی دیتا ہے یا جو لوگ عیسائی حکمراں بل کلنٹن اور یہودی حکمراں نیتن یاہو سے اب بھی دست تعاون بڑھانے پر مصر ہیں تو انھیں جان لینا چاہئے کہ ان کے ہاتھ آخر میں یاس و حسرت کے علاوہ کچھ بھی نہ آئے گا۔ تب وہ اس بات پر اظہار افسوس کریں گے کہ انھوں نے غیروں پر یقین کرکے اپنے ہاتھوں سے اپنی امت کے حوصلہ مند افراد کو ختم کردیا۔ نتیجتاً اب وہ ایسی صورت حال میں ہیں کہ کہیں سے نہ کوئی امید کی کرن دکھائی دیتی ہے اور نہ کوئی انقلابی قدم۔ ▭

دنیا اب ختم ہونے کو ہے

جاپان میں ایک نئے مذہبی فرقے کے ظہور پر خصوصی رپورٹ

بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا بھر میں نئے نئے فرقوں کا ظہور ہو رہا ہے جو ہر لمحہ دنیا والوں کو یہ خبر دے رہے ہیں کہ اب دنیا کے خاتمے کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں امریکہ میں خدائی بادشاہت کے متوالوں کا ظہور ہوا تھا اس کے بعد ہی ایک عیسائی فرقہ اس یقین کے ساتھ سامنے آیا کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر ایک صاحب نے یہ خبر دی کہ خدا کا ظہور اس کی رہائش گاہ پر ہونے والا ہے لیکن خدا وہاں بھی ظہور پذیر نہ ہوا۔ عیسائیوں کا ایک حلقہ بالآخر واشنگٹن ڈی سی کے سبزہ زار پر جا پہنچا اور دن بھر کھلے آسمان کے نیچے خدا کی رحمت کا متلاشی رہا۔ یہ سب تو امریکہ کی باتیں تھیں جہاں نئی صدی کی آمد کا شور و غل کچھ زیادہ ہی سنائی دیتا ہے۔ لیکن مشرق بھی اب نئی صدی کے نئے مسیحاؤں سے خالی نہیں۔ گذشتہ دنوں ٹوکیو سے ایک خبر آئی تھی کہ وہاں ایک زیر زمین راستے میں زہریلی گیس سے بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔ جلد ہی پولیس نے مجرموں کو گرفتار کر لیا پتہ چلا کہ اس زہریلی گیس کی منصوبہ بندی میں کوئی اور نہیں ایک مذہبی گروہ کے روحانی پیشوا کا نام سرفہرست ہے۔

جاپان میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ دنیا خاتمے کے دہانے پر ہے۔ ہر چیز تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں نجات کے لئے ضروری ہے کہ لوگ جلد از جلد اس دنیا کو خیرباد کہہ دیں۔ اور چونکہ عام طور پر لوگ دنیا کی رنگ رلیوں میں اس طرح کھو گئے ہیں کہ وہ آسانی سے اس دنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتے اس لیے اس جاپانی فرقے نے ایک ایسی اسکیم تیار کی کہ وہ جلد از جلد بہت سے لوگوں کو اس دنیا سے زبردستی دوسری دنیا میں بھیج سکے۔ اور اس طرح عام لوگوں کی روحیں سکون سے آشنا ہو سکیں۔ ۱۹۹۵ء میں اسی خیال کے تحت اس گروہ نے ٹوکیو کے ایک مصروف ترین زیر زمین اسٹیشن پر زہریلی گیس چھوڑ دی اور اس طرح اس گروہ کے مطابق بہت سے لوگوں کو اس دنیا کے جھنجھٹوں سے نجات مل گئی اور اب ان کی روحیں ایک ابدی لافانی سکون کے مزے لوٹ رہی ہے۔

اس فرقے کے بانی کا نام اساہارا شوکو ہے جسے اس عقیدہ موت کا بانی کہا جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب ٹوکیو کی ایک عدالت میں شوکو کے مقدمے کی سماعت کا اعلان ہوا تو اس عجیب و غریب شخص کو دیکھنے اور اس کے مقدمے کی کاروائی کو دیکھنے کے لئے شائقین کی اتنی تعداد امنڈ آئی کہ تماش بینوں کے لئے ٹکٹ کی بولی لگانی پڑی۔ کچھ خوش قسمت کمرہ عدالت میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے البتہ ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جنھیں اوم شنریکیو کا پرستار کہا جاتا ہے۔ عدالت کا منظر عجیب و غریب تھا۔ اپنے روحانی پیشوا کے مقدمے کی سماعت کو قریب سے دیکھنے کے لئے معتقدین اور حامی قریب کے نشستوں پر براجمان ہو گئے تھے۔ اساہارا شوکو کو سخت حفاظتی بندوبست میں عدالت میں لایا گیا۔ شوکو کی آنکھوں میں بلا کا اعتماد تھا۔ اسے اس بات پر کچھ بھی افسوس نہ تھا کہ اس کے ایک حکم نامے کی وجہ سے بہت سے لوگ زہریلی گیس کا شکار ہو گئے تھے اس لئے کہ اسے اس بات کا یقین ہے کہ جن لوگوں کو اس کے ذریعے موت ملی وہ اس دنیا کی جھنجھٹ سے نکل کر آسمانی بادشاہت میں سکون کے مزے لے رہے ہیں۔

پولیس کا کہنا ہے کہ شوکو کی گرفتاری اور گروہ کے خلاف قانونی کاروائی سے توقع تھی کہ شاید یہ منحرف لوگ ان حرکتوں سے باز آجائیں لیکن اس دوران جب شوکو جیل میں رہا ہے اس کے ماننے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا

ہے۔ یہی نہیں اب اس گروپ میں نوجوانوں کا ایک ایسا حلقہ داخل ہوگیا ہے جو شوکو کے خیالات کو جدید ذرائع ابلاغ سے پھیلانا خوب جانتا ہے لہٰذا انٹرنیٹ پر عقیدہ موت کی ترویج واشاعت کے لئے Website تیار کیا گیا ہے۔ کلینڈر اور ڈائریوں پر شوکو کی تصاویر اس کی تعلیمات کے ساتھ چھپ رہی ہیں۔ چابی کے چھلوں پر شوکو کی تصویر ہے تو چھوٹے بڑے دلکش تحفے تحائف پر اس کی تعلیمات نقش ہیں۔

گویا کاروبار موت کے فروغ کیلئے ہر طرف زندگی متحرک ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جوں جوں نئی صدی کی آمد کا وقت قریب آتا جائے گا، شوکو کے عقائد میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ چوں کہ شوکو کا مقدمہ اپنے انجام کو پہنچنے میں تیس سال کا عرصہ لگ سکتا ہے اسی لئے اس دوران عقیدہ موت کے حامیوں کو نئے پیروکار تلاش کرنے کیلئے خاصہ وقت مل جائے گا۔ یہ پوچھے جانے پر کہ اگر شوکو کو موت کی سزا ہوگئی تو کیا اس کے ماننے والے اس عقیدے سے تائب ہوجائیں گے۔ ایک نوجوان پیروکار تاکیشیتا کا کہنا ہے کہ نہیں اگر گرو کو موت بھی ہوگئی تب بھی وہ اس عقیدے کو خیرباد نہیں کہے گا اس لئے کہ گرو بے گناہ ہے وہ عام لوگوں کی نجات کے لئے یہ تحریک چلا رہے ہیں۔ پھر یہ کہ آخر حضرت مسیح کو بھی تو لوگوں نے مجرم سمجھ کر صلیب دے دیا تھا لیکن لوگوں کے مجرم سمجھ لینے سے ان کا جرم ثابت نہیں ہوتا۔

ان معاشروں میں جہاں زندگی کھانے کمانے تک محدود ہوکر رہ گئی ہے اور جہاں فرد کی تمام دوڑ دھوپ بہتر معیار زندگی کا حصول قرار پایا ہے۔ وہاں اب ایک عام بے چینی محسوس کی جارہی ہے لوگ یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ آخر اس تمام جدوجہد کا مقصد کیا ہے؟ صبح دفتر جانے اور شام تھکے ہارے گھر واپس آنے اور اسی طرح زندگی کا چکر چلتے رہنے میں آخر لطف کیا ہے؟ اگر بس یہی زندگی ہے تو

جاپان میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ دنیا خاتمے کے دہانے پر ہے۔ ہر چیز تباہی کی طرف جارہی ہے۔ ایسی صورت میں نجات کے لئے ضروری ہے کہ لوگ جلد از جلد اس دنیا کو خیرباد کہہ دیں۔

ع ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے جیسے کسی نے اسے زندگی کے کارخانے میں کولہو کے بیل کی طرح باندھ رکھا ہو جس کا کام صرف چلتے رہنا ہے۔ ایک ایسا سفر جو خود منزل بھی بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس اس بے لطف زندگی سے فرار کا طریقہ موجود ہے تو بہت سے لوگ اس کے پیچھے ہولیتے ہیں۔ گذشتہ سال مارچ میں تائیوان کے ایک گروہ نے جب امریکہ کے قصبہ ٹکساس میں یہ پیشین گوئی کی کہ خدا بہت سے آسمانی جہاز اپنے مقربین کو بچانے کے لئے اس سرزمین پر بھیجنے والا ہے تو امریکہ میں بڑی دلچسپی سے اس خبر کو سنا گیا۔ خدا کا ظہور تو نہ ہوا لیکن ٹکساس اور اس کے اردگرد کے علاقے میں ایک عام سراسیمگی کی کیفیت پھیل گئی اس وقت خدا کے ظہور کی خبر دینے والوں سے امن عامہ کو کوئی خطرہ پیدا نہ ہوا تھا البتہ جاپان میں جو کچھ ہورہا ہے اسے آسانی سے اس لئے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ عقیدہ موت کے حامیوں کو اپنی نجات سے کہیں زیادہ دوسروں کی نجات کی فکر ہے اور دوسروں کو موت سے ہمکنار کرنے کو وہ اپنی مذہبی ذمہ داری سمجھ بیٹھے ہیں۔ پھر یہ کہ اوم شنریکیو فرقہ محض ایک مقامی مسئلہ نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۹۵ء میں جب یہ فرقہ اپنے عروج پر تھا تو جاپان میں اس فرقے میں سترہ ہزار لوگ داخل ہوچکے تھے اور بیس ہزار لوگ روس میں موجود تھے۔ اس

زہریلی گیس سے مرنے والے افراد

کی شاخیں امریکہ اور جرمنی میں بھی موجود ہیں۔ اپنے قائد اساہارا شوکو کی گرفتاری سے پہلے تو اس فرقے کے عزائم جاپانی حکومت کو الٹ پھینکنا اور پوری دنیا کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لینا تھا۔ اب، ہوسکتا ہے ان عزائم کا اظہار علی الاعلان نہ ہوتا ہو لیکن اس مقصد کی خاطر یعنی پوری دنیا کو موت سے ہمکنار کرنے کے لئے شوکو کے ہزاروں ماننے والے دن رات سرگرم ہیں۔ شوکو پر اس وقت سترہ مقدمے چل رہے ہیں۔ ایک عجیب و غریب بات یہ بھی ہے کہ اس عقیدہ موت کے مخالفین کے لئے بھی سزا موت ہی ہے اور جو لوگ اس فرقے میں کچھ دن رہنے کے بعد فرقے کو چھوڑنے کا ارادہ کرتے ہیں انھیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور انکے جسموں کو راکھ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ شوکو کا کہنا ہے کہ جو لوگ اب تک فرقہ کے مذہبی ٹھکانوں پر مارے گئے ہیں انھوں نے دراصل موت کا راستہ اپنی خوشی سے اختیار کیا تھا۔

گو کہ بہت سے لوگ اساہارا کو خیرباد کہہ چکے ہیں لیکن ابھی تک اس کے پیروکاروں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اساہارا ہے کون؟ کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے آنکھوں کی خرابی کا شکار تھا لہٰذا اسے اندھوں کے ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا لیکن چونکہ اساہارا بالکل اندھا نہ تھا اس لئے اندھوں کے اسکول میں اس کا قائدانہ رول بہت جلد نکھر کر سامنے آگیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ہمالیہ کے ترائیوں میں نور بصیرت کی تلاش میں پھرتا رہا۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ اس عقیدہ موت کا مبلغ بن کر جاپان واپس آگیا۔ اس وقت اساہارا کی عمر کوئی ۴۳ سال ہوگی۔ جاپان کے مختلف شہروں میں اساہارا کے بیشمار تربیتی مراکز میں ہر لمحہ اوم منتروں کا ورد جاری ہے۔ اس

عقیدہ موت کے حامیوں کو اپنی نجات سے کہیں زیادہ دوسروں کی نجات کی فکر ہے اور دوسروں کو موت سے ہمکنار کرنے کو وہ اپنی مذہبی ذمہ داری سمجھے بیٹھے ہیں۔

فرقے کے پاس بے پناہ دولت پائی جاتی ہے بالخصوص سستے کمپیوٹر کی تجارت میں اوم کے انجینئروں کو خاص ملکہ حاصل ہے پھر چونکہ ان تجارتی اداروں میں کام کرنے والے اوم کے پیروکار ہیں اس لئے وہ بہت معمولی تنخواہوں پر کام کرتے ہیں۔ تجارت کا بقیہ حصہ اس مشن کو چلا جاتا ہے اس کے علاوہ جو لوگ اس فرقے میں داخل ہونا چاہتے ہیں ان سے بھی بڑی خطیر رقم لی جاتی ہے۔

یوں سمجھئے کہ موت بانٹنے والوں کا کاروبار عروج پر ہے۔ جاپان کے مختلف شہروں میں اساہارا کی تصویر کے ساتھ مختلف کتابچے عقیدہ موت کی تبلیغ کے لئے مفت تقسیم کئے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ اب تک اس فرقے کو چھوڑ چکے ہیں ان کو دوبارہ واپس لانے کے لئے کوشش جاری ہے۔ جاپانی حکومت کے لئے سمجھنا مشکل ہو رہا ہے کہ وہ اس مسئلہ کا کیا کرے؟ اس لئے کہ اگر اساہارا کو سزا ہو جاتی ہے جب بھی اس کے پیروکار عقیدہ موت کو ترک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ جاپان ہی نہیں دنیا بھر میں نئی ہنگامہ خیز صنعتی معاشرے میں پھنسے ہوئے بہت سے لوگوں کو موت زندگی سے بہتر دکھائی دیتی ہے۔ ایسی صورت میں جھوٹے نبیوں اور پیشواؤں کا کام چل نکلنا کچھ عجب نہیں۔

اپنے قارئین سے ...!

ملی ٹائمز میں دفتر کی شکایات کے ازالے کے لئے نیا نظم تشکیل دیا جارہا ہے۔ جن لوگوں کو یہ شکایت ہو کہ ان کا پرچہ وقت پر نہیں ملتا یا خریداری کی رقم ارسال کرنے کے باوجود اب تک جاری نہیں کیا گیا ہے ایسے تمام خریدار اپنی رسیدوں کے حوالے سے دفتر کو اپنی شکایت جلد از جلد ارسال فرمائیں۔

ایجنٹ حضرات بھی اپنی دشواریوں سے واقف کرائیں، انشاء اللہ فوری طور پر مؤثر کاروائی کی جائے گی۔

ملی ٹائمز کے انقلابی پیغام کو گھر گھر لے جانے میں ہماری مدد کیجئے۔

ادارہ

دجالی تہذیب کے ہیڈ کوارٹر امریکہ میں

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فلموں کا سیلاب

امریکہ کو اس وقت دجالی تہذیب کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی اور سازشیں اسی سرزمین سے کنٹرول کی جارہی ہیں۔ مغرب کی تہذیب کو اگر کوئی خطرہ ہے تو صرف اسلام سے۔ کمیونسٹ روس زوال پذیر ہو چکا ہے۔ یورپ جو بڑی حد تک امریکی تہذیب کا ضمیمہ ہے فکری اعتبار سے امریکہ کو یہاں سے کوئی چیلنج دکھائی نہیں دیتا۔ جاپان اور چین کی تہذیب گوکہ اقوام عالم میں اپنا لوہا منوانا چاہتی ہے لیکن ان کے پاس عالمی غلبے کے لئے وسائل نہیں ہیں۔ اس وقت جب دنیا مکمل طور پر یک قطبی سپرپاور کے رحم وکرم پر ہے امریکہ کو اگر کوئی چیلنج دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے۔ دنیا بھر میں مسلم انقلابی اس عزم کے ساتھ سرگرم ہیں کہ دیر یا سویر وہ اس دنیا کی قیادت امریکہ کے ہاتھوں سے نکال کر اسلام کے حوالے کر دیں گے۔ گذشتہ چند برسوں میں عالمی اسلامی خلافت کے قیام کا جو نعرہ بلند ہوتا رہا ہے اسے اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

دنیا کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا ہے کہ مغربی ممالک میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مختلف ممالک سے ہجرت کر کے مغرب کے معاشرے میں پہنچی ہے۔ اس وقت کوئی چھ ملین مسلمان امریکہ میں موجود ہیں اور اس سے کہیں بڑی تعداد مغربی یورپ میں موجود ہے۔ فرانس، جرمنی اور برطانیہ کے بعض شہروں پر تو ایسا گمان ہوتا ہے گویا آپ پاکستان، ترکی یا الجزائر میں موجود ہوں۔ یہ مسلمان عملی اعتبار سے جیسے بھی ہوں ان کی موجودگی سے مغرب کو پہلی بار مسلمانوں کے براہ راست مطالعے کا موقع ملا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے اس زوال میں بھی ہماری معاشرتی خصوصیات نے مغرب کے عام لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب مغربی تہذیب کو خیرباد کہہ کے کچھ لوگ حلقہ اسلام میں داخل نہ ہوتے ہوں۔ مغرب اس صورت حال کو ایک بڑا چیلنج تصور کرتا ہے لہٰذا اس کی کوشش ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ایسا مؤثر پروپیگنڈہ کیا جائے کہ ان کی تصویر میں مغرب کے عام باسیوں کو کوئی کشش

معلوم نہ ہو۔ امریکہ میں موجود یہودی لابی خاص طور پر اس بات کا اہتمام کرتی رہی ہے کہ مغرب کی عیسائی دنیا کو عربوں اور مسلمانوں سے اس حد تک متنفر کر دیا جائے کہ اسلام کے بارے میں وہ کسی معروضی فیصلے تک پہنچنے کے قابل نہ رہ جائیں۔ مغرب کے اخبارات ہوں یا ٹیلی ویژن اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اگر وہاں کچھ دیکھنے کو ملتا ہے تو ایک ایسے مسلمان کی تصویر جو غیض وغضب سے بھرپور ہاتھوں میں کلاشنکوف لہراتا ہوا مغرب سے نبرد آزما ہے۔ ٹیلی ویژن کے پردے پر پیش کیا جانے والا ہر مسلمان دہشت گرد دکھائی دیتا ہے۔ عام دہشت گرد نہیں بلکہ اسلامی دہشت گرد اور یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دراصل اسلام ہے ہی ایسا مذہب جو اپنے ماننے

والوں کو دہشت گردی پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی طرح عربوں کی تصویر ایسے لوگوں کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے جن کے پاس پیسے تو بہت ہیں لیکن ذہنی طور پر ان کے اندر کوئی لیاقت نہیں۔ وہ ان پیسوں کو جنسی تلذذ کے حصول میں ضائع کرتے ہیں۔ عربوں کی اس تصویر کو کچھ اس تسلسل سے پیش کیا گیا ہے کہ خود مسلمانوں کو ان کی اس تصویر پر کچھ یقین سا آنے لگا ہے۔ حالانکہ فلاحی کاموں اور اعلیٰ مقاصد کے لئے

اسی مغرب میں عربوں کا سرمایہ دوسروں سے کہیں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن ان واقعات کو خبروں میں اور فلموں میں اہمیت نہیں دی جاتی۔

ایسی ناولوں کی تعداد کوئی پانچ سو سے کم نہ ہوگی جسے مغرب میں عوامی ناول سمجھا جاتا ہے اور جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر آلود پروپیگنڈہ موجود ہے۔ یہ ناولیں چونکہ خاص مقصد سے لکھی اور لکھوائی جاتی ہیں اس لئے چند ہفتوں کے اندر دنیا بھر میں انھیں اس طرح پھیلایا جاتا ہے کہ لاکھوں کا پیاں قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ ان ناولوں میں عام طور پر یہی دکھایا جاتا ہے کہ مسلمان بنیادی طور پر ایک غیر مہذب جنگجو قوم ہے اور اس کے لئے دراصل اسلام ذمہ دار ہے۔ مغرب کی تہذیب یافتہ سوسائٹی کو اسلام اور مسلمانوں سے خطرہ ہے اس لئے مغرب کو یہ جواز حاصل ہے کہ وہ عربوں اور مسلمانوں کے خلاف سخت سے سخت کاروائی کرے۔ ایسا اس لئے بھی کہ تیل کی دولت ان ہی جنگجو احمقوں کے پاس ہے۔ اگر مغرب نے ان ٹھکانوں کی حفاظت براہ راست خود نہ کی تو خطرہ ہے کہ غیر مہذب مسلمان اسے یا تو تباہ کر ڈالیں یا مہذب دنیا کے خلاف ان وسائل کو استعمال میں لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عراق پر زبردست بمباری اور افغانستان اور سوڈان پر میزائل حملوں کے باوجود مغرب میں عام رائے عامہ ان مظالم پر بے چین نہیں ہوتی۔

اخبارات اور ناولوں سے کہیں زیادہ فلمیں اس کام کو زیادہ مؤثر انداز سے انجام دے رہی ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ فلم کمپنیاں عرب ممالک میں بڑے پیمانے پر تجارت کر رہی ہیں اور جنھیں عرب دنیا سے بے پناہ تجارتی فائدہ ہو رہا ہے وہی کمپنیاں اسلام اور عربوں کے خلاف زہریلی فلموں کی تیاری میں آگے آگے ہیں۔ اس ضمن میں فلم کمپنی فوکس اور کارٹون بنانے والی کمپنی ڈزنی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سچ پوچھا جائے تو ان دو کمپنیوں نے اسلام اور عربوں کے خلاف مغرب میں جس قدر رائے عامہ ہموار کی ہے اتنا مجموعی طور پر اخبارات اور ناول کی اشاعت سے بھی نہ ہوا ہوگا۔ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس مؤثر طریقے سے یہ کمپنیاں مہم چلا رہی ہیں اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عربوں پر ذلت اور زوال کے ان ایام کو طول دیا جائے۔ ان کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کی جائے کہ ساری دنیا ان سے نفرت کرنے لگے اور جب کسی شخص کی نظر کسی عرب یا مسلمان پر پڑے تو وہ اپنے اندر ابکائی کی کیفیت محسوس کرنے لگے۔

> امریکہ کو اگر کوئی چیلنج دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے۔ دنیا بھر میں مسلم انقلابی اس عزم کے ساتھ سرگرم ہیں کہ دیر یا سویر وہ اس دنیا کی قیادت امریکہ کے ہاتھوں سے نکال کر اسلام کے حوالے کر دیں گے۔

> جب وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی حرکات و سکنات بالکل جنگلی جانوروں جیسی معلوم پڑتی ہے۔ بالآخر ان درندوں سے چھٹکارا پانے کے لئے امریکی حکام سخت اقدامات پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

عربوں کو یہ بات سنجیدگی سے سوچنا چاہئے کہ آخر وہ ان کمپنیوں کے خلاف کوئی مؤثر قدم کیوں نہیں اٹھاتے۔ کچھ اور نہیں اگر عرب ممالک ان کمپنیوں کی فلموں کو اپنے یہاں دکھانے پر پابندی لگادیں اور ہر اس تفریحی فلم کا مکمل بائیکاٹ کریں جو عرب ٹیلی ویژن پر دکھائی جاتی ہیں تو ان کمپنیوں پر ہم مؤثر معاشی چپت رسید کر سکتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ہمارے پاس ان فلموں کا کوئی متبادل نہ ہو۔ دوسری کمپنیاں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے موجود ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم ایک متحدہ موقف اختیار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ البتہ یہ سمجھنا تو سادہ لوحی ہوگی کہ صرف ہمارے بائیکاٹ سے اور معاشی خسارے کی وجہ سے یہ کمپنیاں اسلام کے خلاف اپنی پروپیگنڈہ مہم ختم کر دیں گی اس لئے کہ جو لوگ ہمارے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں وہ صرف ازراہ شرارت ایسا نہیں کرتے بلکہ دراصل یہ سب کچھ ایک عالمی منصوبہ بندی کا حصہ ہوتا ہے۔ نفرت پھیلانے والے تو اپنا کام جاری رکھیں گے البتہ اس مکروہ عمل میں ہمارا تعاون ختم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس پروپیگنڈے کا سد باب کیسے کیا جائے تو اس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم ایسی فلمیں بنائیں جس میں اس پروپیگنڈہ مہم کا پردہ چاک کیا گیا ہو اور یہ بتایا گیا ہو کہ ہماری اصل تصویر اس پیش کردہ تصویر سے کتنی مختلف ہے۔

فلم "گھیراؤ" کی ایک مثال

فوکس اور ڈیزنی کمپنی کا بائیکاٹ کرنے کے لئے ہم خصوصیت کے ساتھ کیوں کہتے رہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حال ہی میں فلم "گھیراؤ" جو منظر عام پر آئی ہے وہ فوکس کمپنی کی جانب سے پیش کردہ ہے جو اس وقت امریکہ میں دکھائی جا رہی ہے اور وہاں مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ اس فلم کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مسلمان ایک عجیب و غریب کائنات سمجھے جاتے ہیں اور یہ کہ جس کے سیارے اور ستارے اسلام کے نام پر صرف اور صرف قتل و غارت گری کے لئے حرکت میں رہتے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ عام ٹائٹل بن چکے ہیں جو اکثر تکنیکی اور فنی کاموں میں عرب اور مسلمانوں کے ساتھ چسپاں کر دئے جاتے ہیں۔ یہ فلم خود امریکی مسلمانوں کے خلاف بھی بات کرتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ

...یہ فلم امریکہ کی رائے عامہ کو برانگیختہ کرتی ہے اور امریکی حکام کو ان کے خلاف بھڑکاتی ہے اور فلم یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمان امریکہ کے حقیقی باشندے نہیں ہیں لیکن ان کی شرارت پسند "اسلامی نسبت" جس کو انہوں نے ایک حد تک ختم کر دیا تھا ان کے اندر برابر محرک کا باعث بن رہی ہے۔ فلم کے اندر نیویارک شہر کو بم سے اڑانے اور اس کو کھنڈر میں تبدیل کرنے کی کوشش کو بھی دکھایا گیا ہے۔

گذشتہ سالوں میں ہم نے کئی فلمیں دیکھی تھیں۔ ایک فلم "تنظیمی و تنفیذی فیصلے" Directive and managing dicision دیکھا تھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ عرب دہشت گردوں نے ایک ہوائی جہاز کا اغوا کیا تھا اور اس کے سارے معصوم مسافروں کو قتل کر دیا تھا۔ دوسری فلم جس کا نام "سچے جھوٹ" (True Lies) تھا اس میں مسلم انتہاپسندوں کو فلوریڈا شہر پر نیوکلیر میزائل چھوڑتے ہوئے دکھایا تھا اور اسی طرح سے مزید دوسری فلموں کو بھی اسی طرز پر دکھایا گیا تھا جس میں ایک فلم "خوف کا سفر" (Journey of Terror) اور "دہشت گردی کا فیصلہ" (Trial for Terrorism) اور دوسری فلمیں بھی اسی طرز کی تھیں۔ ان فلموں میں بہت سی عرب اور مسلم شخصیات کو دکھایا گیا تھا، کسی ایک مسلم جماعت کی تحقیر مقصود نہیں تھی۔ حال ہی میں ریلیز ہونے والی فلم "حصار" نے ان تمام فلموں کی مسلم دشمنی کا ریکارڈ توڑ دیا ہے جس میں عرب بنیاد پرستی سے امریکیوں کو متنبہ کیا گیا ہے اور ان کو ایک ایسا خطرہ بتایا گیا ہے جو امریکہ کی سالمیت کے لئے چیلنج بن سکتے ہیں۔

فلم "امریکا میں جہاد" مسلمانوں اور عربوں کے جنگی عزائم پر تبصرہ کرتی ہے۔ خطرناک ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی جس کا مقصد امریکہ کے خلاف اعلان جنگ ہے، اس فلم کا بنیادی فکری محور ہے اور فلم "حصار" میں ان کی حرکات عملی طور پر صرف دھمکیوں تک ہی محدود ہے۔ اس میں ان تمام امریکی عرب کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جو امریکی شہری ہونے کے باوجود نیویارک شہر کے اندر مسلسل

دھماکوں کا پلان بناتے رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جدید سوسائٹی کو مکمل طور سے اپنانے سے انکار کر دیا ہے اور یہ لوگ اس سوسائٹی کو ناپسند کرنے والے گروہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں جن کی نگاہیں اس آزادانہ ماحول اور نظام کو ختم کرنے کی طرف اٹھتی رہتی ہیں۔ ان کے ذریعہ "دہشت گردی کا جال" ایک (Terrorism Network) وجود میں آچکا ہے جو اس خواب کو سچ کر دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جو ان کا خواب ہے۔

فلم میں جن عرب شخصیات کو پیش کیا گیا ہے وہ دھوکہ دھڑی، بد خلقی، سخت دلی اور جنگلی پن جیسے اوصاف سے متصف ہیں۔ بار بار دہشت گردی کے الزام میں امریکی حکومت کثیر تعداد میں اپنے ہی عرب نژاد امریکی مسلمانوں کو قیدی کیمپ میں بھیج کر اپنے لئے پناہ کی راہ ڈھونڈھتی ہے۔ دہشت گردی کو انجام دینے سے پہلے ان کی حرکات اور عمل کو بھی فلم پیش کرتی ہے۔ دکھایا جاتا ہے کہ کس طرح دہشت گرد نیٹ ورک کے تمام ممبران مختلف جگہوں پر دھماکہ کرنے سے پہلے وضو کرتے ہیں، یعنی وضو اور دھماکے میں جو تعلق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہادر اور نڈر ہیں اور ان کا عمل ڈھکا چھپا نہیں ہے اور ان میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو حقارت کے ساتھ اپنے ساتھ کام کرنے والی عورتوں پر تھوک دیا کرتے ہیں۔ جب وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی حرکات و سکنات بالکل جنگلی جانوروں جیسی معلوم پڑتی ہے۔ بالآخر ان درندوں سے چھٹکارا پانے کے لئے امریکی حکام سخت اقدامات پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

فلم کے اندر یہ چیز بھی دکھائی جاتی ہے کہ متعدد دہشت گردانہ سرگرمیوں کی وجہ سے بروکلین محلہ میں ایمرجنسی جیسی صورت حال کا اعلان کر دیا جاتا ہے، امریکہ کو اس خطرے سے نکالنے کے لئے فوج کو حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے فلم دہشت گردی کے پلان بنانے والوں کو قتل کر دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے

فلم کے آخری حصے میں متضاد چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک عرب

جو دہشت گردانہ سرگرمیوں کا صدر ہے اپنی ایک امریکی خاتون دوست کو نیویارک میں غسل خانے کے اندر تھپڑ مارتا ہے۔ یہ خاتون اس کے ساتھ فیڈرل ریسرچ سینٹر کے اندر کام کرتی ہے، وہ لڑکی اس عرب کو وضو کرتے ہوئے، وضو کرنے کے بعد کپڑا پہنتے ہوئے اور ان سرگرمیوں کو انجام دینے کے لئے اپنی کمر کو کسی مضبوط بندھن سے باندھتے ہوئے دیکھتی ہے اور اس سے یہ پوچھنے کی کوشش کرتی ہے کہ اسلام تو دین رحمت ہے اور عرب جوان یہ سمجھتا ہے کہ یہ امریکی عورت اسلام کے بارے میں زیادہ سمجھتی ہے تو فوراً عرب نوجوان اسلام کے بارے میں سوال کا جواب دینے کے بجائے اس کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے لڑکی! اسلام کے بارے میں سوال مت کیا کر۔

بہر حال امریکی اسلامی تعلقات کونسل نے اس فلم کے تمام گوشوں اور حصوں کے خلاف احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ فلم امریکہ کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ جذبات کو بڑھانے میں شریک ہے اور عرب کمیٹی نے امریکہ کے اندر نسلی اور ذاتی تفوق کو ختم کرنے کے لئے ان دونوں فلم کے پروڈیوسروں کے پاس ایک خط بھیجا ہے جس میں ان دونوں پروڈیوسروں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اور امریکہ کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس فلم کی وجہ سے جو حالات پیدا ہوگئے ہیں اس پر احتجاج کیا گیا ہے۔ اس فلم سے مسلمانوں کے اندر غم وغصہ، قلق واضطراب ابھی تک برابر پایا جارہا ہے لیکن کمپنی مسلمانوں کے جذبات کی پرواکئے بغیر مسلسل فلم کی نمائش کررہی ہے۔

ڈیزنی کمپنی اہانت آمیز حرکات پر مصر

مسلمانوں اور عربوں کے خلاف ڈیزنی کمپنی کی اہانت آمیز حرکات مسلسل جاری ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ اس کی بدتمیزیوں میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انہیں تمام چیزوں کی وجہ سے میں "علاؤالدین" "کوندور کی سرگرمی" "چھپانے والا" "دولھا باپ" اور "موجودہ فوج کے اندر" فلم دیکھنے کے لئے حاضر ہوا۔

فلم "علاؤالدین" "الف لیلہ ولیلہ" کے قصوں سے لے کر بنائی گئی ہے۔

اس فلم کے اندر ہیرو علاؤالدین ایک گانا گاتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک سے آئے گا جس کے باشندے اپنے ملک میں تمہارے کانوں کو کاٹیں گے اس وقت تمہارے سر کی شکل ان کو خوش نہیں کرسکے گی۔ وہ ملک بغیر قائد و رہنما کے ایک سمندر ہے جو لوگوں سے بھرا ہوا ٹھاٹھیں مار رہا ہے لیکن پھر بھی وہ میرا ملک ہے۔

مسلمان چاند کی عبادت کرتے ہیں اور خالص مسلمان ۳۶ غیر شادی شدہ عورتوں سے اپنی شادیاں کرتے ہیں تاکہ اپنی شہوت بجھا سکیں۔ امریکہ میں درسی کتابیں بھی ان تمام افکار کی تصویر کشی میں برابر کی شریک ہیں۔

کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس مؤثر طریقے سے یہ کمپنیاں مہم چلا رہی ہیں اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عربوں پر ذلت اور زوال کے ان ایام کو طول دیا جائے۔ ان کی ایسی گھناونی تصویر پیش کی جائے کہ ساری دنیا ان سے نفرت کرنے لگے اور جب کسی شخص کی نظر کسی عرب یا مسلمان پر پڑے تو وہ اپنے اندر ابکائی کی کیفیت محسوس کرنے لگے۔

فلم "کوندور کی سرگرمی" میں عربوں کو بدمعاشوں، بیوقوفوں اور غلاموں کی تجارت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو صحرائے عرب کے اندر چوری کرکے چھپائے گئے دو سو چالیس ٹن سونے کی تلاش میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ نگرانی کرنے والے اور دیکھنے والے کچھ ڈاکوؤں پر حملہ کردیتے ہیں جو اونٹوں پر سوار ہوکر، کالے کپڑوں میں ملبوس، ان کی طرف آرہے ہوتے ہیں اور یہ لوگ خوبصورت سفید فام ہوتے ہیں۔ عرب ان کے گروہ کی دو نوجوان عورتوں کا اغوا کرلے جاتے ہیں۔ بدوؤں کے خیمے میں ایک عربی دلال ہاتھ میں کوڑا لئے عورتوں کو بیچنے اور خریدنے والے بازار میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اکھڑ، اجڈ بدوی ان دونوں عورتوں کی قیمت ایک سو پچاس اونٹوں کے بدلے میں پیش کرتا ہے لیکن سفید فام نوجوان اس خیمے پر حملہ کردیتے ہیں اور دونوں عورتوں کو ان بدوؤں کے چنگل سے چھڑا لیتے ہیں۔

فلم "کاظم" میں ایک عرب کو بلیک مارکیٹ کے تاجر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے جس کے پاس دو مددگار ہوتے ہیں لیکن وہ دونوں مددگار خوبصورت امریکیوں کی پٹائی سے اس عرب تاجر کو نہیں روکتے ہیں اور اس فلم میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہم اس تاجر کو جانتے ہیں جو انتہائی حریص آدمی ہے۔ وہ امریکی مردوں اور مردوں کی آنکھوں کے کھانے کو ترجیح دے گا اور اپنے انتہا درجے کی اس حرص ولالچ سے فائدہ اٹھائے گا جو لالچ دنیا کے تمام مالوں پر قبضہ کرنے کے خواب کا سبب بن رہی ہے۔

فلم "دولھا باپ" میں دو مالدار عرب شوہر دکھائی دیتے ہیں جس میں سے ایک کو اس وقت بیوقوف اور گھمنڈی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو فلم کے ہیرو کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو سو ملین ڈالر ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

امریکی عرب کمیٹی نے فلم کے اس متعصبانہ گمراہ کن رویے کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ کبھی یہ اہانت آمیز رویہ بہت برا ثابت ہو سکتا ہے جو ۱۹۹۵ء سے ہالی ووڈ تین ملین عرب امریکیوں کے بارے میں اختیار کئے ہوئے ہے۔

ان دونوں کمپنیوں کی حرکتوں نے امریکہ کی دوسری فلم ساز کمپنیوں کو اسلام دشمنی کی راہ دکھائی ہے۔ جو پے در پے اسلام اور جہاد کے متعلق کراہیت، ناپسندیدگی، تعصب، تشدد اور عورتوں پر ظلم وجبر جیسے معاملات زیر بحث لاتے ہیں۔

امریکی ذرائع ابلاغ کا توہین آمیز رویہ

پروفیسر جاک شاہین جو الینوی یونیورسٹی میں پبلک ریلیشن کے استاذ ہیں اور ان بڑے محققین میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے ان جیسے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا ہے نے اس صورت حال پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں ہیں۔ ان میں سے "ایک عرب ٹیلی ویژن پر" کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہو چکی ہے اور دوسری "امریکی قومی تہذیب کے اندر عرب اور مسلمانوں کی قابل نمونہ تصویر" کے عنوان سے ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب امریکی ذرائع ابلاغ میں مسلمانوں اور اسلام کی اہانت آمیزی پر بحث کرتی ہے۔ یہی وہ معاملہ ہے جو منفی صورت میں عام لوگوں کے ذہن کو ابھارنے اور مسلمانوں کے خلاف فضا تیار کرنے کا سبب بنا ہے۔ ایک رائے شماری جو امریکہ کی مختلف کمیونٹیز اور طبقات کے درمیان تعلقات کے مسئلے پر ۱۹۹۴ء میں کی گئی تھی جس میں مختلف نسل کے تین ہزار امریکی شریک کئے گئے تھے، کے نتائج کچھ اس طرح ہیں:

- وہاں کے اصل باشندوں میں ۴۲ فی صد لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمان ایک ایسے دین کے پیروکار ہیں جو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے یا اس کی تائید کرتا ہے۔
- ۷۰ فیصد لوگوں نے یہ کہا کہ مسلمان یورپ اور امریکہ کے دشمن ہیں۔
- ۴۳ فیصد لوگوں نے کہا ہے کہ مسلمان، عورتوں پر ظلم وجبر کرتے ہیں اور ان کے ساتھ امتیاز برتتے ہیں۔

مؤلف نے یہ بھی لکھا ہے کہ امریکی ذرائع ابلاغ نہ صرف مسلمانوں اور عربوں کی بری تصویر کشی کرتی ہے بلکہ اسلام اور عالم عرب سے متعلق تمام چیزوں کے بارے میں اپنے باشندوں کو بے خبر بھی رکھتی ہے۔ خود امریکی مسلمانوں کو بھی

امریکی میڈیا مسلسل امریکیوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ ان مسلمانوں کا جو تمہارے درمیان چلتے پھرتے ہیں اور جن سے تمہاری تہذیب کو خطرہ ہے ان کا کوئی علاج ڈھونڈھو، ورنہ تمہارے تجارتی مراکز، سڑکیں، بازار سب کچھ خطرے میں ہیں۔

مغرب کے اخبارات ہوں یا ٹیلی ویژن اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اگر وہاں کچھ دیکھنے کو ملتا ہے تو ایک ایسے مسلمان کی تصویر جو غیض و غضب سے بھرپور ہاتھوں میں کلاشنکوف لہراتا ہوا مغرب سے نبرد آزما ہے۔

عالم اسلام سے بے خبر رکھنے کی عمداً کوشش کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رائے شماری اور تحقیق کے درمیان ۷۰ فیصد امریکیوں نے یہ کہا کہ ایران ایک عربی ملک ہے اور قریبی نسبت کے اعتبار سے ایران اور عراق ایک ملک تصور کئے جاتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں اور اسی رائے شماری کے درمیان یہ بات بھی ظاہر ہوئی اور اس کا چرچا ہوا کہ مسلمان چاند کی عبادت کرتے ہیں اور خالص مسلمان ۳۶ غیر شادی شدہ عورتوں سے اپنی شادیاں کرتے ہیں تاکہ اپنی شہوت بجھا سکیں۔ امریکہ میں درسی کتابیں بھی ان تمام افکار کی تصویر کشی میں برابر کی شریک ہیں۔

سماجیات سے متعلق ایک کتاب ہے جو چھٹی کلاس میں پڑھائی جاتی ہے جس میں مشرق وسطی اور عرب دنیا کے بارے میں قدرے تفصیل سے ذکر ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ عربوں کو اونٹ، خیمے اور حسب ونسب والی شریف اور عمدہ عورتیں پسند ہیں۔ طلباء کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ روایتی مسلم لڑکیاں مدرسہ اور اسکول نہیں جاتی ہیں اور نہ ہی عورتیں کسی بھی چیز کی مالکہ ہو سکتی ہیں۔ اور اس میں یہ بات بھی درج ہے کہ مرد اپنی وسعت کے مطابق عورت کو صرف تین مرتبہ "انت طالق" کہہ کر طلاق دے دیتا ہے۔ کتاب کے مؤلفین پڑھنے والی طالبات سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا تم یہ پسند کرتی ہو کہ مشرق وسطی کی ایک عورت بنو؟

ان تمام تماشوں کے بارے میں استاذ جاک شاہین کہتے ہیں کہ ہالی ووڈ نے ویڈیو فلموں کے ذریعہ اسلام اور عربوں کے تمسخر کا سلسلہ چلا رکھا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر ہفتہ پندرہ سے بیس فلمیں (۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۹۹۵ء) تک دکھائی جاتی رہی ہیں۔ ہالی ووڈ نے عرب مسلمانوں کو ایک سو پچاس فلموں میں مکروہ صورت میں پیش کیا ہے جو کہ حقیقت میں مشرق وسطی کے مسلمانوں یا عرب مسلمانوں کی تصویر سے میل نہیں کھاتی۔ ان فلموں نے مسلمانوں کی تصویر کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے یہ سب کچھ معمول کی بات ہو۔

مؤلف نے کتاب "بیرون ممالک کے معصوم لوگ" کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کے مؤلف مارک ٹوائن ہیں۔ انھوں نے ۱۸۶۹ء میں یہ کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے مسلمانوں کو بت پرست، ملحد، جنگلی بتایا اور یہ بھی لکھا تھا کہ ان کی نگاہیں سخت ہیں اور مکروہ ہیں۔ یہی متعصبانہ ذہنیت اب بیسویں صدی کی فلموں میں کام کر رہی ہے بس لب ولہجہ بدل گیا ہے۔ مثال کے طور پر عرب کی روایتی تصویر وحشی اور تہذیب مخالف کی آج بھی ان فلموں کا حصہ ہے۔ ساتویں اور

آٹھویں دہائیوں میں عربوں کی تصویر پٹرولیم کے مالک شیخ کی تھی جو عورتوں سے عشق کرتا تھا اور ان میں سے اکثر سے شادیاں بھی کرلیتا تھا لیکن صدی کی نوی دہائیوں میں عرب مسلم کی تصویر ایک ایسے متعصب، اصول پسند، دہشت گرد کے روپ میں پیش کی جاتی ہے جو قتل کرنے سے پہلے نماز پڑھتا ہے، اور جس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں بم۔

نئی امریکی ٹیلی فلموں میں عربوں کو غیر مہذب، جنگجو گروہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے جو عالمی معیشت کو تباہ و برباد کررہے ہیں۔ مغرب کی عورتوں کا اغوا کرتے ہیں، معصوم لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور اسرائیل و امریکہ کے خلاف نیوکلیئر ہتھیار کی ذخیرہ اندوزی کے لئے روپے ادا کرتے ہیں۔

فلم "اپنی بیٹی کے بغیر نہیں" کے اندر ایک مسلمان کو جھوٹا اور منافق کی شکل میں دکھایا جاتا ہے جو اپنی امریکی بیوی اور بیٹی کا اغوا کرتا ہے اور انھیں امریکہ سے ایران لے جاتا ہے۔ وہ انھیں وہاں قیدی بنانے اور ان کے ساتھ برا برتاؤ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا ہے بلکہ فخر کے ساتھ اس کے چہرے پر تھپڑ بھی رسید کرتا ہے اور قرآن کی قسم کھاکر فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ میری وسعت و طاقت کے مطابق میرے پاس سب سے بڑا سرمایہ اسلام ہے جو میں اپنی بیٹی کو پیش کرتا ہوں۔

فلم "قیدی" (Hostages) مسلمانوں کو مفلوک الحال اور غلام کے طور پر پیش کرتی ہے جو اپنے علاوہ دوسروں کا قتل کرتے ہیں۔ فلم "گھیراؤ" میں امریکی سفیر اسلامی ملک کے سفیر سے کہتا ہے کہ تمہارے وطن کے لوگ غیر مہذب اور ظالم ہیں اور اس کے بعد امریکی انٹلی جنیس کا ڈائریکٹر امریکی عرب کالونیوں کی لسٹ میں ان دہشت گردوں کو تلاش کرتا ہے جنہوں نے بعض تجارتی مراکز کو دھماکوں سے اڑا دیا تھا۔

ان بدترین تصویر کشی کی مثالیں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں جن کو عرب اور مسلمانوں کے بارے میں امریکی ٹیلی ویژن اور سینما برابر پیش کررہے ہیں۔ جب کوئی دہشت گردی کا حادثہ پیش آتا ہے تو امریکی مسلمانوں کے لئے کچھ بولنا سخت مشکل ہوجاتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے خلاف اس زہریلے پروپیگنڈے کا سدباب کیسے کریں۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکی میڈیا مسلسل امریکیوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ ان مسلمانوں کا جو تمہارے درمیان چلتے پھرتے ہیں اور جن سے تمہاری تہذیب کو خطرہ ہے ان کا کوئی علاج ڈھونڈھو، ورنہ تمہارے تجارتی مراکز، سڑکیں، بازار سب کچھ خطرے میں ہیں۔ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے عام امریکی مسلمان خود کو ہروقت خطرے میں گھرا محسوس کرتا ہے۔

حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر ہم ان شرانگیزیوں کو نظرانداز کریں تو یہ خود بہ خود ختم ہوجائیں گی جیسا کہ بعض سادہ لوح لوگ سمجھتے ہیں اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سلمان رشدی کے معاملے میں احتجاج کرکے ہم نے اسے شہرت اور اہمیت دے دی۔ یہاں معاملہ بہت زیادہ سنگین ہے، اگر اس کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو مغرب میں اسلامی علامتوں کے ساتھ مسلمانوں کا چلنا پھرنا مشکل ہوجائے گا اور پوری دنیا میں ہماری تصویر مسخ ہوکر رہ جائے گی۔

روایات پر اسلام کا دھوکہ نہ ہو

خواتین کی ایک دینی درس گاہ میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر قائد ملی ڈاکٹر راشد شاز کا خطاب

امت کی ماؤں، بہنو اور بیٹیو!

السلام علیکم ورحمہ اللہ

یہ پہلا اتفاق نہیں جب مجھے خواتین کی کسی دینی درسگاہ میں آنے کا موقع ملا ہے البتہ آپ کے یہاں جس چیز نے مجھے بہت مسرور کیا وہ آپ تمام طالبات کا دین مبین کو غالب کرنے کی آرزو ہے جس کی ایک جھلک ابھی میں نے پینٹنگ کے مقابلے میں دیکھی سچ پوچھئے تو آپ لوگوں نے مجھے پینٹنگ کے مقابلے کا جج بنا کر سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔ گوکہ میں اس میدان کا آدمی نہیں البتہ فکری اعتبار سے مجھے وہ پینٹنگ بہت پسند آئی جس میں ایک چھ سات سالہ طالب علم نے دنیا کو اسلام کے غلبے کی آرزو ظاہر کی ہے، خدا کرے ہم سبھوں کا یہ خواب جلد از جلد شرمندہ تعبیر ہو۔

جلسہ تقسیم اسناد ، مدرسۃ فضیلۃ العلوم نسواں بنگلور

سہ پہر کے اجلاس میں بچیوں کی جو تقاریر یہاں ہوتی رہی ہیں اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی تعلیم گاہ ایک روایتی درس گاہ نہیں بلکہ آپ کے اساتذہ اس بات کا گہرا احساس رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اس چھوٹے سے ادارے سے اتنے بڑے کام کے لئے یقیناً آپ اور آپ کے اساتذہ قابل مبارکباد ہیں۔

اس موقع پر جب آپ طلباء و طالبات اپنی سند لے کر عملی زندگی میں داخل ہونے والے ہیں بہتر ہوگا کہ آپ کو چند باتیں بطور نصیحت گوش گذار کردوں اس لئے کہ آپ نے اب تک جو کچھ پڑھا لکھا ہے اور بالخصوص طالبات کے سلسلے میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آپ لوگوں نے اپنی تقاریر میں جس طرح غلبہ اسلام کے لئے اپنا سب کچھ تج دینے کا پروگرام بنایا ہے اور جس طرح آپ میں سے بعض طالبات مسلم خواتین میں اسلامی بیداری لانے کا پروگرام بنا رہی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ جب آپ عملی میدان میں داخل ہوں تو یہ سب کچھ آپ کو اتنا آسان دکھائی نہ دے بلکہ عین اس بات کا امکان ہے کہ خود آپ کا مسلم معاشرہ آپ کے اس جذبہ ایمانی کو تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھے، اسے اس بات پر غصہ آئے کہ آپ باورچی خانے کی تنگ کوٹھری سے نکل کر غلبہ اسلام کا نعرہ کیوں بلند کرنے لگی ہیں؟ اس بات کا بھی امکان ہے کہ جن لوگوں سے اور اپنے خاندان کے جن افراد سے آپ کو اس مہم میں تعاون کی توقع ہے خود ان کی طرف سے یہ بات کہی جانے لگے کہ بیٹی! تمہاری باتیں تو سب ٹھیک ہیں لیکن معاشرے میں تمہاری چلت پھرت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، اس لئے بہتر ہے کہ اس ایجنڈے کو فوری طور پر مؤخر کردو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس قسم کی مزاحمت کے لئے ابھی سے تیار رہیں اور آپ کے اندر اس صورت حال سے بدگمان ہو جانے یا مایوس ہو کر بیٹھ جانے کی کیفیت پیدا نہ ہو، پھر آپ پر یہ بات بھی واضح رہے کہ آپ پر جس چیز کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری ہے وہ اسلام اور اس کا انقلابی پیغام ہے۔ رہے مسلم معاشرے کے موجودہ مذہبی تصورات یا سماجی بندشیں اور رسم و رواج، تو ان کا

احترام اسی وقت تک کیا جائے جب تک کہ یہ اسلامی پیغام کا احترام کرتے ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن باتوں کو مسلم معاشرے نے سماجی اور تاریخی محرکات کی وجہ سے تقدس کا درجہ دے دیا ہے آپ اسے عین اسلام سمجھ بیٹھیں کہ خدا نخواستہ ایسا ہو گیا تو آپ اسلام کے نام پر ہند اسلامی ثقافت کی مبلغ بن جائیں گی۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ ہم مسلمان اپنی ملی زندگی میں اسلام کو جس طرح برت رہے ہیں غیر مسلم اسی کو عین اسلام جانتے ہیں اور اس طرح ہماری بہت سی غلط حرکتیں اسلام کے بارے میں لوگوں کے سامنے انتہائی غلط تصویر پیش کرتی ہیں۔ ہماری ہر غلطی اسلام کی تصویر بگاڑتی ہے بالخصوص عورتوں کے سلسلے میں جو تصورات ہماری سوسائٹی میں رائج ہو گئے ہیں انہیں اکثر لوگ عین اسلام سمجھنے کا دھوکا کرتے ہیں، اس لئے آپ کو عملی زندگی میں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ آپ اسلام کو اپنائیں اور روایات سے اپنا دامن بچائیں خواہ یہ روایات مسلم معاشرے کی روایات کیوں نہ ہوں اور خواہ اسے کسی وجہ سے تقدس کا درجہ کیوں نہ حاصل ہو گیا ہو۔

ہم جس ملک میں رہ رہے ہیں وہاں صدیوں سے عورت کی شخصیت کی نفی کی گئی ہے۔ ہندو معاشرے میں عورت کی حیثیت مرد کے ایک ضمیمہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آزاد عورت کا تصور جس کی اپنی شخصیت اور شناخت ہو، اسلام کے علاوہ شاید ہی کہیں پایا جاتا ہو۔ البتہ ہندوستانی مسلم معاشرے میں حادثہ یہ ہوا ہے کہ رفتہ رفتہ عورت کے سلسلے میں غیر اسلامی تصورات مسلم معاشرے میں رائج ہو گئے۔ سمجھا یہ گیا کہ عورت کی صلاحیتوں کا بہترین اظہار باورچی خانے میں ہو سکتا ہے یا پھر وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ مرد کی طرح اس کی بھی دانش ورانہ شخصیت ہوتی ہے، دنیا کے معاملات میں وہ بھی ایک رائے رکھ سکتی ہے۔ اس طرح کی باتیں مسلم معاشرے کے اجتماعی حافظے سے غائب ہوتی گئیں، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ روایتی مذہبی گھروں میں جہاں مرد کی تعلیم کے لئے سارے وسائل جھونک دیئے گئے وہاں عورت کو بنیادی تعلیم کا مکلف بھی نہ سمجھا گیا۔ اگر تعلیم کے نام پر مذہبی حلقوں میں کبھی کوئی بات آئی تو بس اس حد تک کہ عورت گھر پر تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لے، اردو زبان کی شد بد ہو جائے، ناظرہ قرآن پڑھنا آ جائے اور بس۔ برصغیر کے مشہور عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی نے تو اس بات کی بھی شرط عائد کر دی کہ اگر یہ تعلیم ایسی استانیوں کے ذریعے ہو جو مفت پڑھائیں تو یہ مستحسن ہے کہ اس سے بقول ان کے علم میں برکت ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کئے جائیں تو ہمارا روشن خیال مذہبی طبقہ بھی اس بات کے لئے آمادہ نہ تھا۔ حتیٰ کہ سرسید جنہیں تعلیمی تحریک کا سب سے بڑا مبلغ سمجھا جاتا ہے اور جنہوں نے مردوں کی تعلیم کے لئے تمام مخالفتوں کے باوجود زبردست تحریک چلائی وہ بھی اس بات کے قائل نہ ہو سکے کہ تعلیم کے حصول کا حق مردوں کی طرح عورتوں کا بھی ہے۔ سرسید نے صاف گوئی سے یہ بات کہی کہ "وہ عورتوں کو تعلیم دلا کر ان کو اسلامی حقوق سے آگاہ کرانا نہیں چاہتے۔" ان کے بقول "جاہل عورت اپنے حقوق سے ناواقف ہوتی ہے اس لئے مطمئن ہوتی ہے، اگر وہ تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق سے واقف ہو گئی تو اس کی زندگی عذاب بن جائے گی۔"

جب ہمارے باشعور لوگ صرف اس ڈر سے عورت کی تعلیم کی مخالفت پر اتر آئیں کہ کہیں اسے ان حقوق کا علم نہ ہو جائے جو اسلام نے اسے عطا کئے ہیں تو آپ اندازہ کریں گے کہ بے شعور لوگ جو ہر عالم نما شخص کے رویے کو عین اسلام سمجھ بیٹھتے ہیں، ان کے یہاں عورت کی اسلامی حیثیت کے سلسلے میں کیا کیا غلط فہمی نہ پائی جاتی ہوگی۔ ایک طرف عورتوں کو تعلیم سے محروم کرنے کی مہم اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے"

ہندوستان میں مسلم معاشرے نے اس بات کا پورا اہتمام کر ڈالا کہ مسلم خاتون کو اس کی اصل حیثیت کی ہوا نہ لگ جائے۔ اسے اس بات کا علم نہ ہو کہ معاشرے کو صحیح خطوط پر چلائے رکھنے کے لئے اس پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا اور یہ بات بہت زیادہ پرانی نہیں ہے جب مذہبی لوگوں نے اس طرح کے رسالے لکھے جس میں عورت کے لئے لکھنا سیکھنے کی مخالفت کی گئی۔ طرفہ تو یہ ہے کہ اس رویے کو اسلام اور شریعت کے حوالے سے معتبر بنانے کی کوشش بھی کی جاتی رہی۔ اس طرح کے خیالات جس کا اسلام سے دور دور تک

آپ کو عملی زندگی میں اکثر ایسا محسوس ہوگا کہ روایات اور اسلامی اقدار ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ایسی صورت میں آپ کو چاہئے کہ آپ بلاتکلف روایات کو ترک کر کے اسلام کو اختیار کر لیں خواہ ایسا کرنے میں آپ کو جتنی بھی مزاحمت کا سامنا ہو۔

بڑے ناموں سے اکتساب فیض ضرور کیجئے اور قدیم و جدید متکلمین اسلام کی تصنیفات سے بھی فائدہ اٹھائیے لیکن یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ کسی مسئلہ پر فیصلہ کرتے وقت اللہ اور اس کے رسولؐ کے قول کو ہی کلیدی اہمیت حاصل رہے۔

کوئی تعلق نہ تھا محض مصالح امت اور فرضی فتنے کے سد باب کے خیال سے ہمارے درمیان معتبر بنادئے گئے۔ خود ساختہ تاویلات کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جس کے آگے کتاب و سنت کی واضح ہدایات بھی ساقط الاعتبار ہوگئیں۔ یہ بات بھلادی گئی کہ عورت کو اللہ اور اس کے رسول نے جو حقوق عطا کئے ہیں اس میں کمی یا زیادتی کرنے کا اختیار کسی اور شخص کو نہیں ہوسکتا۔ بعض چیزیں ہوسکتا ہے ہمیں سماجی مصالح کے خلاف معلوم ہوتی ہوں لیکن اسلام تو نام ہی اس بات کا ہے کہ رسولؐ تمہیں جو کچھ دے اسے لے لو اور جن باتوں سے روکے اس سے رک جاؤ۔

جب عورت کو اعلی تعلیم کے لائق نہ سمجھا جائے، اسے گھر کی چہار دیواری کے اندر ایک الگ دنیا کا باسی بنادیا جائے، باہر کے واقعات و حالات کا اسے کچھ علم نہ ہو اور امور زندگی میں اس کی رائے کی اہمیت صفر ہوجائے تو ایک ایسی مخلوق کا پیدا ہونا فطری تھا جو عقل و فہم سے عاری امت کے مصالح سے ناواقف اور خیر امت کے احساس سے عاری ہو۔ ظاہر ہے ان بے شعور گودوں میں پیدا ہونے والی نسلیں زندگی کے اعلی مقاصد سے واقف نہیں ہوسکتی تھیں۔ امت کے زوال میں ان بے شعور ماؤں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

ہمارے یہاں بد قسمتی یہ ہوئی کہ جاگیر دارانہ زوال پذیر معاشرے میں رائج تفوق کی جھوٹی علامتوں کو عین اسلام سمجھ لیا گیا۔ اور چونکہ اس معاشرے میں بہترین عورت کا تصور ایک ایسے وجود سے عبارت تھا جسے باہر کی دنیا کی ہوا نہ لگی ہو اور جس کے بارے میں باہر کی دنیا کو کچھ علم نہ ہو۔ اس کی شخصیت پر اتنا دبیز پردہ ڈال دیا گیا کہ اس کے نام سے واقفیت کو بھی عیب جانا گیا۔ کوئی اس کی آواز نہ سن لے، کوئی اس کے خیالات سے واقف نہ ہوجائے۔ باہر کی دنیا کلی طور پر مردوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس Setup میں عورت سے صرف یہ توقع کی گئی کہ مرد جو کچھ کہے وہ اس کی تائید کرتی جائے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ کہتا ہو۔ مرد جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے صحیح ہونے کے لئے صرف یہی کافی سمجھا گیا کہ وہ مرد ہے۔ ہمارے یہاں چوٹی کے مذہبی لوگوں نے عورت کو شوہر کی اطاعت کے نام پر جو تعلیم دی اس میں صحیح اور غلط کی تمیز جاتی رہی، حق اور باطل کے پیمانے ٹوٹ گئے۔ عورت کو اتنی بھی اجازت نہ دی گئی کہ وہ مرد کے احکام کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھتی اور اگر کوئی بات کتاب و سنت سے ٹکراتی معلوم ہو تو اس کے بارے میں دبے لفظوں میں بھی کوئی احتجاج کرتی۔ اس سے صرف یہ توقع کی گئی کہ وہ شوہر کے احکام بلا چوں و چرا بجالائے۔ اس رویے کا گو کہ حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں لیکن مذہب کے نام پر اطاعت شعاری کی جو تعلیم دی گئی اس سے عمومی تاثر یہی پیدا ہوا کہ اسلام کو اسی طرح کی اطاعت شعار مخلوق مطلوب ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی جنھوں نے ہمارے عہد میں اسلامی فکر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں اور جن کی مشہور زمانہ کتاب بہشتی زیور کو عورتوں کے درمیان قبولیت عام حاصل ہے اور جسے غالباً روایتی مسلم خواتین کے درمیان قرآن کے بعد سب سے معتبر اسلامی ماخذ سمجھا جاتا ہے وہاں بھی عورت سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے مرد کے احکامات بجالائے۔ بہشتی زیور میں مولانا تھانوی نے لکھا ہے "عورت کو شوہر کے احکامات بلا چوں و چرا بجالانا چاہئے یہاں تک کہ اگر وہ کہے کہ ایک پہاڑ سے پتھر اٹھاکر دوسرے پہاڑ تک لے جاؤ اور پھر دوسرے سے تیسرے تک تو اسے یہی کرنا چاہئے" ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "اگر وہ دن کو رات بتائے تو عورت کو بھی چاہئے کہ دن کو رات کہنے لگے" اب جس معاشرے میں اس طرح کی غیر مشروط اطاعت کو عین اسلامی حکم سمجھا جانے لگے وہاں صالح عورت کا پیدا ہونا تو درکنار، صحیح اور غلط کی تمیز بھی ختم ہوجاتی ہے۔

عزیز بہنو! یاد رکھئے کہ اسلام میں عورت اور مرد دونوں کی جداگانہ حیثیتیں ہیں۔ دونوں کو اپنا اپنا حساب دینا ہے۔ روز محشر آپ صرف یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتیں کہ آپ کے شوہر نے، بھائی نے یا باپ نے آپ کو معصیت کا حکم دیا تھا

اس لئے آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ اگر بد قسمتی سے آپ کے گھر کے مرد معصیت کی زندگی کے خوگر ہو چکے ہیں، اگر اسلام اور اسلامی تحریک سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے تو آپ کے لئے بھی معصیت بھری زندگی جینے کے لئے جواز فراہم ہو جاتا ہے۔ نہیں، ہر گز نہیں۔ ان کا عمل ان کے ساتھ ہے اور آپ کا عمل آپ کے ساتھ، البتہ ایسی صورت حال میں آپ کی ذمہ داری دوہری ہو جاتی ہے۔ آپ کو خود بھی اسلام پر قائم رہنا ہے اور اپنے گھر کے مردوں کو بھی راہ راست پر لانے کی ہر ممکن سعی کرنی ہے۔ یہی صحیح اسلامی رویہ ہے۔ رہی یہ بات کہ اگر بد قسمتی سے شوہر معصیت کی زندگی میں مبتلا ہے اور اگر خدا نخواستہ آپ کے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا سلسلہ جاری ہے تو آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس صورت حال پر صبر کر کے بیٹھ جائیں البتہ روایتی مسلم گھروں میں عورت سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ کسی ایسی صورت حال میں احتجاج کرنے کے بجائے شوہر کی مرضی پر راضی ہو جائے گی۔ بد قسمتی سے روایتی دینی کتابوں میں کچھ اسی قسم کی تعلیم و تلقین ملتی ہے۔ بہشتی زیور اور اس قبیل کی کتابوں میں کچھ اسی طرح کا مشورہ ملتا ہے۔ مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ اگر شوہر کسی دوسری عورت سے ملتا ہے تو اسے تنہائی میں سمجھاؤ پھر بھی باز نہ آئے تو صبر کر کے بیٹھ جاؤ۔ اس ضمن میں مولانا نے لکھنو کی ایک بی بی کا واقعہ لکھا ہے جس کے میاں بازاری عورت کے رسیا تھے۔ وہ اس عورت سے علی الاعلان تعلق ہی نہیں رکھتے بلکہ بیوی سے اس کے لئے کھانا پکوا کر بھی منگواتے تھے۔ اطاعت شعار بیوی نے شروع میں اس بات کا برا مانا پھر بڑی خوش دلی سے میاں کے شوق میں معاون بن گئی۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس بیوی کی خدمت گزاری کا شہر بھر میں چرچا ہے اور خلق خدا میں اس کا نام ہو رہا ہے۔ ہمارے خیال میں نیک مسلم خاتون کی یہ تصویر اسلام کی اصل تصویر سے میل نہیں کھاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح فرمان ہے کہ:

"معصیت کے کاموں میں اطاعت نہیں ہو سکتی۔"

اسلام جو پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے اس میں ہر فرد کو نصح و خیر خواہی کے جذبے کے تحت دوسرے کو خیر کی تلقین کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ یہ اس کا فریضہ بن جاتا ہے حتیٰ کہ چھوٹا بھی بڑے کو مستحسن انداز سے اس کی غلطیوں پر ٹوک

عورتوں کے سلسلے میں جو تصورات ہماری سوسائٹی میں رائج ہو گئے ہیں انہیں اکثر لوگ عین اسلام سمجھنے کا دھوکا کرتے ہیں اس لئے آپ کو عملی زندگی میں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ آپ اسلام کو اپنائیں اور روایات سے اپنا دامن بچائیں

یہ بات بھلا دی گئی کہ عورت کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو حقوق عطا کئے ہیں اس میں کمی یا زیادتی کرنے کا اختیار کسی اور شخص کو نہیں ہو سکتا۔ بعض چیزیں ہو سکتا ہے ہمیں سماجی مصالح کے خلاف معلوم ہوتی ہوں لیکن اسلام تو نام ہی اس بات کا ہے کہ رسولؐ تمہیں جو کچھ دے اسے لے لو اور جن باتوں سے روکے اس سے رک جاؤ۔

سکتا ہے۔ برائی سے اجتناب اور بھلائی کی تلقین میں بچے، بوڑھے، مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ کا شوہر غلط راستے پر چل نکلے تو یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اسے صحیح راستے پر لانے کے لئے ہر ممکن سعی کریں۔ ایسا نہ ہو کہ روایتی وفاشعاری میں آپ دونوں اپنی آخرت کھوٹی کر لیں۔

دختران ملت! فراغت کی سند لے کر جب آپ عملی زندگی میں قدم رکھیں گی تو آپ کو متواتر ان تصورات سے واسطہ پڑے گا جو عورت کے حوالے سے مسلم معاشرے میں عام ہیں۔ اکثر ایسا محسوس ہوگا کہ جن باتوں کی اسلام نے آپ کو اجازت دے رکھی ہے، مسلم معاشرہ آپ کو ان کاموں کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ کے دوران ریاض کی سڑکوں پر کوئی چالیس پچاس مسلم خواتین کار چلاتی ہوئی نکل آئیں یہ گویا اس بات کا مطالبہ تھا کہ انھیں احکام حجاب کی پابندی کے ساتھ کار چلانے کی اجازت دی جائے۔ اس واقعہ سے سعودی عرب کے روایتی معاشرے میں ایک بھونچال کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مشاورتیں منعقد ہوئیں، علماء کے درمیان صلاح و مشورے ہونے لگے کہ اس مسئلہ سے کس طرح نپٹا جائے۔ علماء کی ایک مجلس میں جہاں اس مسئلہ پر گرما گرم بحث جاری تھی میں بھی موجود تھا۔ میں نے کہا کہ عام طور پر ایک سعودی خاتون غیر ملکی ڈرائیور کے ساتھ اپنی ضروریات کے لئے باہر نکلنے پر مجبور ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب شوہر دفاتر میں مصروف ہے تو بیوی کسی اجنبی غیر محرم ڈرائیور کے ساتھ اپنی ضروریات کے لئے نکلتی ہے۔ اب اگر احکام حجاب کی شرائط کے ساتھ ان خواتین کو خود ہی ڈرائیونگ کی اجازت مل جائے تو غیر محرم ڈرائیور سے نجات مل جائے گی اور یہ شکل پہلی شکل کے مقابلے میں شریعت سے زیادہ قریب ہوگی۔ علماء نے کہا، بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر ایک بار تم نے عورت کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھما دی تو بس وہ ہاتھ سے نکل گئی۔ سعودی معاشرے کی قدیم روایات اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کی خواتین اپنے ہاتھوں سے گاڑیاں چلائیں جب کہ اسلام احکام حجاب کی شرائط کے ساتھ سماجی زندگی میں عورت کی چلت پھرت کی عام اجازت دیتا ہے۔ آپ کو عملی زندگی میں اکثر ایسا محسوس ہوگا کہ روایات اور اسلامی اقدار ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ایسی

صورت میں آپ کو چاہیئے کہ آپ بلا تکلف روایات کو ترک کرکے اسلام کو اختیار کرلیں خواہ ایسا کرنے میں آپ کو جتنی بھی مزاحمت کا سامنا ہو۔ فراغت کی یہ ڈگریاں جو آج آپ کو دی گئی ہیں اس اعتماد کا اظہار ہیں کہ آپ کے اندر کتاب و سنت کی روشنی میں سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ کے فضل سے آپ اب کتاب و سنت کے مطالب سے آگاہ ہیں۔ اب یہ دیکھیں کہ کتاب و سنت سے آپ کے ان اقدامات کی توثیق ہوتی ہے یا نہیں۔ سچ پوچھئے تو آپ کا اصل کام یہ ہے کہ آپ دوسروں کی طرح محض مسلمہ روایات کو دین سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔ جب کتاب و سنت کی کسوٹی موجود ہے تو اس کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھئے۔ جو چیز پوری اترے اسے قبول کیجئے اور جس چیز کی شریعت میں گنجائش نہ ہو اسے ترک کر دیجئے۔ خواہ اس کی حمایت میں بڑے بڑے علماء کے اقوال ہی کیوں نہ موجود ہوں اس لئے کہ ہمارے لئے صرف اللہ اور اس کے رسول کا فرمان ہی اصل حجت ہے۔

اگر آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو کسوٹی بنائیں گی یا بڑے ناموں پر تکیہ کرنے کا رجحان اور ان کی فہم کو سب کچھ سمجھنے کا خیال آپ کے یہاں قوی ہوتا گیا تو آپ اپنے اس علم سے جو آپ نے یہاں حاصل کیا ہے۔ کچھ بھی فائدہ نہ اٹھا سکیں گی۔ بڑے ناموں سے اکتساب فیض ضرور کیجئے اور قدیم و جدید متکلمین اسلام کی تصنیفات سے بھی فائدہ اٹھائیے لیکن یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ کسی مسئلہ پر فیصلہ کرتے وقت اللہ اور اس کے رسول کے قول کو ہی کلیدی اہمیت حاصل رہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ روایت پرستی کے زیر اثر بعض بڑے اہم مفکرین کے یہاں بھی آپ کو ایسی باتیں مل جائیں گی جسے آپ کے لئے حلق سے اتارنا مشکل ہوگا۔ سچ پوچھئے تو آپ کا اصل امتحان یہیں ہے۔ دین و شریعت سے نابلد عام قاری کے مقابلے میں جو ہر بات کو مستند ناموں کے حوالے سے مطالب دین سمجھ کر قبول کرتا چلا جاتا ہے آپ کو چاہئے کہ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا محاکمہ کریں۔ آپ دیکھیں گی کہ بعض باتیں حیرت انگیز طور پر کتنی مختلف ہیں۔ آپ سمجھتی ہیں کہ اب کتاب و سنت کے علم کے بعد آپ عملی زندگی میں اپنے شوہر کو شاید مفید مشورے دینے کی اہل ہوگئی ہیں لیکن روایتی مذہب پرستی آپ کے اس رول کو آسانی سے قبول نہیں کرے گی۔ ورنہ جانیے میں اس بات کی وضاحت کے لئے امام غزالی کی مشہور زمانہ تصنیف احیاء العلوم سے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ حضرت عمر کے حوالے سے صاحب احیاء العلوم نے لکھا ہے کہ "عورتوں کی مرضی کے خلاف عمل کیا کرو کہ ان کے خلاف کرنے میں برکت ہوتی ہے، عورتوں سے مشورہ لو اور جو کچھ وہ مشورہ دیں اس کے خلاف کرو"۔ اب ایک طرف آپ کو اس بات پر اصرار ہوگا کہ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے شوہر کو صحیح مشورہ دینے کی اہل ہوگئی ہیں لیکن روایتی دین آپ کی اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ امام غزالی نے حسن بصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جو شخص اپنی بیوی کا مطیع بنا رہے کہ جو وہ چاہے وہی کرے تو حق تعالیٰ اس کو دوزخ میں اوندھا گرا دے گا"۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں جو عورت کو امور مشاورت سے دور رکھنا چاہتی ہے، اسلام کی اس تصویر سے مطابقت نہیں رکھتی جہاں وقت کا رسول بھی عین حدیبیہ جیسے بحرانی لمحے میں اپنی بیوی ام سلمیٰ کے مشورے کو صائب سمجھتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب صلح حدیبیہ کے نتیجے میں صحابہ کرام میں عام بددلی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ انھیں اپنے محبوب رسولؐ کا حکم بجالانے میں بھی پس و پیش ہوا تو اس وقت ام سلمیٰ نے رسول اللہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ قربانی اور حلق میں پہل کریں۔ آپ کے پختہ ارادے کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کریں گے اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔ ایک طرف رسولؐ کا اسوہ ہے جہاں عورت کی صحیح رائے قبول کی جاتی ہے اور دوسری طرف ہماری روایتی کتابیں جہاں عورت کا صرف عورت ہونا ہی اسے ساقط الاعتبار کر دیتا ہے۔

الحمد للہ کہ آپ کے پاس کتاب و سنت کا علم موجود ہے۔ اس زوال زدہ مسلم معاشرے میں آپ کو اپنا راستہ خود بنانا ہے۔ اگر آپ نے دین کو روایت پرستی سے الگ کرلیا تو آپ کے لئے آگے چلنا آسان ہو جائے گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ملت کی ان بچیوں کے ذریعے اپنے دین کے غلبے کا کام لے اور تازہ بہ تازہ عالمات کے دلوں میں دین مبین کے غلبے کا جو خواب بڑی مشکلوں سے سجایا گیا ہے وہ جلد از جلد حقیقت کا روپ اختیار کرلے۔

لبنان میں سنّی اسلامی تحریکیں

لبنان کی اسلامی جماعت نے ملک کے اندر آنے والی تبدیلیوں کا ساتھ دینے اور اسلامی ضوابط کے مطابق سیاسی عمل میں شرکت اور لبنان میں ایک انسانی ریاست کے قیام میں تمام لبنانیوں کے تعاون کے حصول کی کوشش میں ایک نئی سیاسی پارٹی کی بنیاد ڈالنے کا اعلان کر دیا ہے۔

اس نئی پارٹی کے قیام کا اعلان جس کا نام حزب الاصلاح ہے، اسلامی جماعتوں کی تحریک میں ایک اہم سیاسی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نئی پارٹی کی تشکیل کا اعلان جماعت کی ایک عام کانفرنس کے فوراً بعد کیا گیا جس کے شرکاء نے متفقہ طور پر نتیجہ نکالا تھا کہ کوئی بھی سیاسی عمل اس وقت تک مفید اور بار آور ثابت نہ ہوگا، جب تک کہ تمام مذاہب کے یکساں احترام اور انھیں ان کے مخصوص ضابطوں پر عمل کی آزادی کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے ایک نئے لبنان کی تعمیر کا جذبہ اور ارادہ لوگوں میں پیدا نہ کیا جائے، اس مقصد کے لیے ایک سیاسی پارٹی وجود میں نہ لائی جائے۔ کانفرنس کے بعد ریڈیو پر نشر کیے گئے اس اعلان میں یہ کہا گیا تھا کہ اسلامی تحریک کی یہ کوشش ہوگی کہ لبنان ایک ایسا ملک بن جائے جہاں مکمل طور پر عدل و انصاف اور حقیقی مساوات کا بول بالا ہو اور جہاں انسانی حقوق اور انسانی آزادی کو مکمل تحفظ حاصل ہو۔ بیان میں اس جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ کانفرنس نے اس مقصد کے لئے ایک نئی سیاسی پارٹی کے قیام کا فیصلہ کیا ہے جو لبنانی عوام کی پارٹی ہوگی جس کے دروازے ہر فرد پر کھلے ہوں گے اور جو لبنان کے سیاسی میدان میں اس مقصد کو لے کر اترے گی کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح کر سکے۔

در حقیقت لبنان میں اسلامی بیداری ملک کے مختلف حلقوں کے درمیان تنازع کا موضوع بن گئی جنھوں نے اسے اسلامی احساس محرومی سے تعبیر کیا۔ اسی لیے اسلامی دائرہ عمل مذہبی دعوت و تبلیغ کے مرحلے سے نکل کر ایک ایسے مرحلے میں آگیا جہاں وہ عوامی مسائل میں حارج ہونے لگا اور ایسے منصوبے اور تصورات پیش کرنے لگا جو ان اسلامی مبلغین کی ترجیحات پر پورے اترتے ہوں جنھیں یہ نظر آگیا تھا کہ ۱۹۸۲ کے بعد سے پیدا ہونے والا خلاء ابھی مسلم طاقت سے پر نہیں ہوا ہے۔

لبنان میں اسلامی تحریک کا اثر خواہ کتنا بھی رہا ہو اس کے لیڈروں نے ان خطرات کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا جو لبنان میں درپیش حقائق ان سے تسلیم کروا رہے تھے اور انھیں الجزائر اور ترکی سے ملتے جلتے تجربات کا بیڑہ اٹھانے سے روک رہے تھے۔ اس طرح نہ تو کسی اسلامی جمہوریہ کی گنجائش تھی اور نہ ہی اقتدار پر کنٹرول اور قوت بازو کے بل بوتے پر حالات میں تبدیلی لانا ممکن تھا۔ اسلامی جمہوریہ کے قیام کے دعوے سے حزب اللہ کی دست برداری کے تجربے کی مثال ان قائدوں کے سامنے پہلے ہی موجود تھی۔

لبنان میں نئی اسلامی بنیاد پرستی کا تجربہ اس کی مقابل شیعہ بنیاد پرستی سے مختلف ہے۔ اگر دونوں کے درمیان کوئی بڑی مشابہت ملتی بھی ہے تو اسی وقت جب دو ناکام تجربے لبنانی خانہ جنگی کے دوران ہوئے تھے اور دونوں ہی پہلی جنگ میں کود پڑنے کے بعد خانہ جنگی کی مہم کو لبنانی اور فلسطینی یساری فوجوں کے سپرد کر کے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ تاہم شیعہ اور سنی دونوں فریق اسرائیل کے قدم اکھاڑنے اور فلسطین اور اس کے لبنانی یساری حلیف کے اثر کے زائل ہونے کے بعد پھر ابھرے۔ سنی اسلامی تحریکیں شیعوں سے ذرا پیچھے رہ گئیں اور نویں دہائی کی شروعات تک موقع کے انتظار میں رہیں تاکہ وہ مزید مستحکم ہو سکیں اور پوری قوت کے ساتھ سامنے آسکیں یہاں تک کہ ان کے اختلافات بھی ساتھ ہی ساتھ سامنے آجائیں۔

۱۹۹۲ء میں اسلام پسندوں کی کامیابی خواہ وہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ہوں یا جماعت "احباش" سے اور لبنانی پارلیامنٹ میں ان کے داخلے کے بعد ایسا تنزل آیا کہ ۱۹۹۶ء میں جماعت اسلامی کا صرف ایک امیدوار منتخب ہوا۔ بعض افراد نے ۱۹۹۲ء کی کامیابی کو نئی لہر کی کشش کے سر باندھا، کسی نے اسے عوامی حقیقت سے تعبیر تو کیا بعض حلقوں نے عیسائیوں کی طرف سے اس انتخاب کے بائیکاٹ کو اپنی کامیابی کا ذریعہ ٹھہرایا۔ اس طرح ۱۹۹۶ء میں اسلام پسندوں کی ناکامی کی وجہ انتخابات میں عیسائیوں کی بڑے پیمانے پر شرکت بھی اس کے علاوہ امیدواروں کی زیادہ تعداد اور داخلی اختلافات بھی ان کے حق میں مضر ثابت ہوئے۔ ۱۹۹۸ء میں اسلام پسندوں کو اس ناکامی کے ازالے کا موقع مل گیا جب طرابلس اور صیدا کے میونسپل کارپوریشن میں انھوں نے آٹھ نشستیں حاصل کر لیں۔

لبنان کے سنی اسلامی منظرنامے پر دو دھارے غالب ہیں۔ ایک جماعت اسلامی اور دوسری جماعت احباش۔ ان دو دھاروں کی موجودگی تقریباً دیگر تمام دھاروں کو بے وقعت کر دیتی ہے اور جن کے لیے جماعت احباش سے مقابلہ کرنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ جماعت اسلامی کی اتباع کریں کیونکہ احباش بیشتر اسلامی دھارے کے دشمن کی طرف داری کرتے رہے ہیں اور اس کا سبب ان کے درمیان طریق عبادت کا اختلاف ہے۔

یہ اختلافات اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ دارالفتوی اور جماعت اسلامی اور سلفی عقیدے کے لوگوں کے خلاف جب سے احباش کا ایک حلقہ ابھر کر سامنے آیا ہے، مساجد میں قتل و خون کے واقعات ہونے لگے ہیں کیونکہ وہ ان سب کو مسلمانوں کے ملک میں ایک سازشی گروہ سے تعبیر کرتے ہیں اور پچھلے دنوں بیروت اور صیدا کی سڑکوں پر دونوں فریقوں کے حامیوں کے درمیان زبردست جھڑپیں اور مقابلہ آرائیاں ہوتی رہیں ہیں اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر قتل و اغوا کے الزام عائد کیے جاتے رہے ہیں۔ جمعیۃ المشاریع کے صدر کا قتل انہی مقابلہ آرائیوں کی ایک ایک کڑی ہے اور جب اس میں ماخوذ چار نوجوانوں کو پھانسی کا حکم ہوا تو جماعت اسلامی نے ایک پرزور تعزیتی جلوس نکالا جس میں جماعت احباش کی پرزور مذمت کی گئی۔

لبنان میں دیگر سنی جماعتوں کے نام ہیں : عبادالرحمن، الفتوۃ الاسلامیۃ، جمعیۃ الغوث الاسلامیۃ، جمعیۃ دعوۃ الاسلامیۃ اور جمعیۃ الانقاذ الاسلامیۃ، اس کے علاوہ لبنان میں فلسطینی اسلامی تنظیمیں بھی ہیں جن کے نام ہیں: الجماعۃ الاسلامیۃ، حرکۃ الجہاد الاسلامی، حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ، جمعیۃ المشاریع الخیریۃ، عصبۃ الانصار، انصار اللہ، الحرکۃ الانصاریۃ المجاھدۃ، ھیئۃ علماء فلسطین، حزب التحریر الاسلامی۔

لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب و جگر
تا خلافت کی بنا بھارت میں ہو پھر استوار

اپنا وطن عزیز بھارت اس وقت دار الکفر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے سچے مسلمانوں سے توقع کرتا ہے کہ وہ اس کو دار الاسلام بنائیں، جس طرح اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ منورہ میں رہ کر پورے عرب کو دار الاسلام بنایا اور ہم مسلمانوں کو خیر امت بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے تاکہ قیامت تک پوری دنیا کو دار الاسلام بناتے رہیں۔

بھارت کی آبادی اب ایک ارب ہے، مسلمان بھی بیس کروڑ ہیں لیکن افسوس، اصلی مسلمان ہزار میں چند ہی ہیں، باقی نسلی، نقلی، قومی، کمزور ایمان، اسلامی تعلیمات سے ناواقف مسلمان ہیں۔ ایک بڑا کام یہ ہے کہ ان نسلی، نقلی، کمزور ایمان مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے واقف کرا کے اصلی، پورا، پکا مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور عرب کو دار الاسلام بنانے کے سلسلہ میں ہر طرح کی جسمانی، ذہنی اور قلبی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن بھارت کے حالات اور زمانہ مختلف ہیں، یہاں قانونی اور جمہوری حکومت ہے، فکر و عمل کی آزادی ہے، جماعت سازی کی آزادی ہے۔ جماعت اسلامی ہند بھارت میں ستاون سالوں سے اقامت دین کی کوشش کر رہی ہے۔ میرے پاس ایک درجن غیر مسلم، برہمن، راجپورت، کائستھ اسلام کو سمجھنے آئے اور مسلمان ہو کر گئے۔ کسی کو بس میں "سلامتی کا راستہ" دے دیا، اس کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ آسام میں ایک نیپالی بدھسٹ کو "کانتی" پرچہ دے دیا، اس کو پسند آیا وہ اس کا خریدار بن گیا۔ اس میں جو اسلامی کتابوں کا اشتہار تھا ان کو منگا کر پڑھا پھر ہندی قرآن منگا کر پڑھا اور مسلمان بن گیا۔ پدم کمار سے فرید احمد ہو گیا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا　　ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

لہٰذا ہم کو جاگنا چاہیے اور بھارت کے عوام الناس کو اسلام کی دعوت پیش کرنی چاہیے۔　　(محمد حسنین سید)

آج کے مسلمان

یونیسکو کے جائزے کے مطابق اس وقت دنیا کی آبادی ۶ ارب ہے۔ ان میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے لیکن نجم الدین اربکان کے کہنے کے مطابق مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ ارب ہے۔ یونیسکو کے جائزے کے مطابق ۸۵ فیصدی مسلمان ان پڑھ ہیں، یہ صورت حال نہایت افسوس ناک ہے۔ موجودہ مسلمانوں کو بھی تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) پیدائشی نسلی یا قومی مسلمان: جو کسی مسلم خاندان میں پیدا ہوا ہو وہ سب نسلی یا قومی مسلمان کہے جاسکتے ہیں۔ ان میں سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، چھاگلہ، ہولوائی، عصمت چغتائی وغیرہ جو اسلام دشمن اور اسلام دشمنوں کے آلہ کار ہیں۔

(۲) دوسرے نمبر پر کمزور ایمان اور منافق مسلمان: جو بظاہر شکل و صورت سے مسلمان نظر آتے ہیں، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، زکوٰۃ اور حج بھی کر لیتے ہیں لیکن تھوڑے فائدے اور نقصان سے بچنے کے لئے جھوٹ بول لیتے ہیں، امانت میں خیانت کرتے ہیں، عہد کی پابندی نہیں کرتے ہیں جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ منافق کی تین پہچان ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بھی بولے، امین بنایا جائے تو خیانت کرے، کسی سے عہد کرے تو اس کو پورا نہ کر سکے۔

(۳) سچے یا اصلی مسلمان: جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم فرماں بردار ہو سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔" (آل عمران ۱۰۲)

دوسری آیت "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال، رشتے داروں اور یتیموں پر مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لئے پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہی راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ اور "یا ایھا الذین آمنوا آمنوا" یعنی ایک ایمان ہے قلبی اور ایک ایمان ہے قولی۔ فرمایا گیا "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔" (التحریم)

یہاں بھی صرف زبان سے کلمہ طیبہ کی شہادت کافی نہیں ہے بلکہ دل سے خود ایمان لائے اور اپنے بیوی، بچوں کو اسلام کی تعلیم دے اس پر عمل کر کے اپنے بیوی، بچوں کے سامنے نمونہ پیش کرے تب ہی جہنم کی آگ سے بچ سکتا ہے۔

محمد حسنین سید
اسلام نگر، رسول پور، پوسٹ آفس: میڈیکل کالج در بھنگہ (بہار)

ایام کے دوران مہندی لگانا کیسا ہے؟

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال اس شوہر کے بارے میں کیا حکم ہے جو اپنی بیوی سے دو سال سے الگ تھلگ رہ رہا ہو باوجود اس کے کہ ان دونوں کی رہائش ایک ہی گھر میں ہے۔ مزید یہ کہ شوہر کی دو دیگر بیویاں بھی اس کے ہمراہ موجود ہیں اور اسی گھر میں ہیں؟ ثمینہ بیگم۔ بہار

جواب اسلامی شریعت میں بیوی کی مرضی کے بغیر اس سے چار ماہ سے زیادہ عرصے تک کے لیے بستر الگ رکھنا کسی شوہر کے لیے جائز نہیں۔ ظاہر ہے یہ بات بیوی کے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث ہوگی۔ شوہر کو چاہئے کہ اگر اس کی ایک سے زائد بیویاں ہیں تو ان کے درمیان مساوات اور عدل کا برتاؤ کرے اور ہر اعتبار سے اس اصول پر عمل کرے خواہ وہ ان کے پاس رات گذارنے کا معاملہ ہو یا اخراجات کی کفالت، ان کی دیکھ ریکھ اور خبر گیری کا۔ تادیبی کاروائی کے طور پر کسی بیوی کا بستر اسی حالت میں الگ کیا جاسکتا ہے جب وہ نافرمان ہو۔

سوال کیا ایام کے دوران عورتوں کے لیے مہندی لگانا جائز ہے اور کیا جب تک مہندی کا رنگ ہاتھ پر رہے گا اسے نجاست سمجھا جائے گا؟ شاہین خانم۔ بستی (یوپی)

جواب عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ حیض کی حالت میں اپنے ہاتھوں پر مہندی لگائے۔ حائضہ کے جسم پر نجاست کا اطلاق نہیں ہوتا اور اسی لیے اس سے مصافحہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات رسول اللہؐ کے اس عمل سے ثابت ہے کہ آپ نے اسی پیالے سے پانی پیا جس میں حضرت عائشہ نے پیا تھا اور وہ اس وقت حیض کی حالت میں تھیں۔ آپ نے اسی طرف اپنا منہ لگاتے ہوئے جدھر سے عائشہ نے پانی پیا تھا، فرمایا۔ تمہارا حیض تمہارے ہاتھ پر نہیں لگا ہوا ہے۔ اس لیے وہ مہندی بھی پاک ہے اور جہاں پر لگی ہے وہ جگہ بھی پاک ہے۔

سوال اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے یہ کہے کہ تم میرے لیے ماں کی طرح ہو تو کیا شوہر پر ظہار واقع ہو جائے گی۔ عبدالباسط۔ سدھارتھ نگر (یوپی)

جواب شیخ عبداللہ بن منیع فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر کہ کیا عورت کی طرف سے ظہار واقع ہوتا ہے یا نہیں، علماء میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بیشتر کا خیال ہے کہ جس طرح طلاق مرد کی طرف سے واقع ہوتی ہے اسی طرح ظہار بھی مرد کی طرف سے ہی واقع ہوگا۔ بعض کا خیال ہے کہ عورت کی طرف سے اقرار ظہار کی صورت میں اس پر کفارہ واجب ہوگا۔

سوال کیا کسی شوہر کے لیے دو سال سے زیادہ مدت تک بیوی سے جدا رہنا جائز ہے اور شرعی نقطہ نظر سے کتنے عرصے کے بعد شوہر کا بیوی سے رجوع کرنا ضروری ہے؟ فیروز اختر۔ نئی دہلی

جواب شوہر پر واجب ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ حسن معاشرت برتے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے کہ عاشروھن بالمعروف۔ معاشرت کا حق بیوی کی طرف سے شوہر پر اور شوہر کی طرف سے بیوی پر واجب ہے۔ معاشرۃ بالمعروف سے مراد یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے لمبی مدت کے لیے جدا نہ ہو۔ ہاں اگر بعض ضروریات مثلاً ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں بیوی کی رضامندی سے ایسا ہو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ ایسی صورت میں شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کے رہنے کا ایسی جگہ انتظام کرے جہاں اسے کوئی پریشانی نہ ہو اور اس کی حفاظت ہو سکے۔

سوال میرے والد بضد ہیں کہ میں رشتے داروں میں ایک لڑکی سے شادی کروں کیونکہ اس طرح ان کا خیال ہے کہ اس میں بھلائی ہے اور یہ شادی خاندان میں آپسی رشتوں کو تقویت دینے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ دوسری طرف مجھے وہ لڑکی بالکل پسند نہیں۔ اب میں اس مخمصے میں ہوں کہ کیا اس معاملے میں والدین کی اطاعت مجھ پر واجب ہے اور اگر میں اس تجویز کو رد کردوں تو میرا انکار کیا قابل عذاب ہوگا؟ (محمد ناصر۔ اگرتلا)

جواب آپ کے مراسلے کا جواب دو پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے۔ ایک پہلو یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو ایسی جگہ شادی کرنے پر مجبور کرے جس کیلئے وہ خود ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہے چاہے وہ شادی رشتہ داروں میں ہونی ہو یا غیروں میں اور خواہ اس سے کتنی ہی مالی منفعت حاصل ہونے والی ہو یا عزت و تکریم میں اضافہ ہونیوالا ہو یا خاندان میں طاقت و شہرت بڑھنے والی ہو۔ آپ کے ماں باپ میں سے کسی کو شرعاً اختیار نہیں ہے کہ ایسے معاملے میں جس کا تعلق آپ کے مستقبل سے ہے اپنا فیصلہ آپ پر مسلط کریں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ کی نظر میں کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جسے آپ خود پسند کرتے ہوں اور شادی کے خواہش مند ہیں تو آپ اپنے والدین سے صاف طور پر کہہ دیں کہ وہ رشتے داروں کے علاوہ کہیں لڑکی دیکھیں۔ ممکن ہے وہ آپ کو پسند آجائے اور اس طرح آپ والدین کو بھی اس انتخاب میں شریک کرلیں۔

بقیہ افسوس کہ ہم آپ کی کوئی خدمت نہ کرسکیں گے

کرنے کے بجائے آپ نے عاق اور طلاق کا راستہ اختیار کیا۔ یہ آپ کے ضمیر نے کیسے گوارا کیا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ شاید آپ کے عقد ثانی کی راہ ہموار کرنے کا یہی آسان ترین طریقہ تھا۔ عقد ثانی میں تو کوئی قباحت نہیں ہے لیکن جو عذر آپ نے تراشا ہے وہ ایک ہوش و حواس والے انسان کے لیے حد درجہ باعث شرم ہے۔ اب جو لوگ اس اقدام سے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ آپکی نظر میں دنیا سے نرالے ٹھہرے جبکہ آپ خود نفس پرستی کی بدترین مثال قائم کرنے پر آمادہ ہیں۔ روحانی اعمال کو آپ ہی جیسے ہوس پرستوں نے دو کوڑی کا بناکر رکھ دیا ہے۔ افسوس کہ ہم آپکی کوئی خدمت نہ کرسکیں گے۔ اللہ تمام مسلمانوں کو ہوس کے غلبے سے محفوظ رکھے۔

عمل کا صحیح معیار کچھ اور نہیں، صرف اسلام ہے

عہد حاضر میں امت مسلمہ پر سرمایہ داری کے نظریے کا غلبہ ہے نہ کہ ان افکار کا جن کا منبع اسلام ہے۔ ایسے بہت سے باطل تصورات میں سے جنھوں نے مسلم ذہن پر یلغار کی ہے ایک یہ بھی ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کون سا عمل صالح ہے اور کون سا برا ہے۔ ذہن و دماغ کو رہبر بنایا جاتا ہے۔ اس یلغار نے بے شمار مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے کیونکہ وہ اپنے معاملات میں اسلامی اصول کے بجائے خود اپنے ذہن پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔

خیر و شر کے تعین میں عقل و ذہن کی رہبری تسلیم کرنے کے سلسلے میں گذشتہ کئی تہذیبوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یونانی فلسفیوں اور حکماء مثلاً ارسطو اور افلاطون نے اپنی کئی معروف دستاویزی تحریروں میں اس رجحان کی پیروی کی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے بعد شاہی فتوحات کے نتیجے میں امت محمدیہ کا واسطہ اس طرز فکر سے پڑا۔ ان علاقوں پر اپنا تسلط مستحکم کرنے کی غرض سے بعض مسلمانوں نے یونانی فلسفیوں کے افکار کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس سرگرمی کا مقصد تو واضح طور پر نئے علاقوں میں آباد افراد کو اپنے نظام میں شامل کرنا اور انھیں اسلام کی طرف راغب کرنا ہونا چاہئے تھا۔ یونانی فلسفے کی فہم پیدا کر کے مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ غیر مسلموں کے اختیار کردہ اور پھیلائے جانے والے باطل نظریات کا تدارک کرتے تاکہ اسلام کا پیغام ان تک باسانی پہنچایا جاسکے۔ افسوس کہ ایسے بھی بہت سے مسلمان اس وقت تھے جو اس مطالعہ کا اصل مقصد فراموش کر بیٹھے اور اس حد تک یونانی افکار و نظریات سے مسحور ہوگئے کہ اسلام کی از سر نو تعبیر کرنے میں لگ گئے تاکہ اسے بھی باطل افکار سے ہم آہنگ کر دیں۔

اس غلطی کے نتیجے میں سامنے والا معروف ترین فرقہ معتزلیوں کا تھا جس کی تاویلوں سے گمراہ ہو کر بہت سے مسلمان عمل کے معیار کی بنیاد عقل و ذہن کو سمجھ بیٹھے۔ سرمایہ پرست قوموں کی یلغار نے اس کج فکری کو اور ہوا دے دی اور یہ یلغار اسلامی ممالک میں مختلف سرمایہ دارانہ انجمنوں اور اداروں کی شکل میں اپنے قدم جماتی گئی جہاں وہ اپنے افکار باطلہ کی خوب تشہیر کرتی رہی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اگر اسلام کو نظرانداز کر کے صالح اور غیر صالح کے تعین میں ذہن و عقل کی روشنی پر ہی بھروسہ کیا گیا تو اس سے انسانوں کے اندر باہم خود غرضی اور استحصال کے جذبے کو فروغ ہوگا اور اس سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگی کہ ایک ہی مسئلے پر مختلف رایوں کا اظہار ہوگا اور وہ سب ایک دوسرے سے متضاد ہوں گی۔

اسی فکری تضاد کا نتیجہ ہے کہ اسرائیل کو کبھی دشمن قرار دیا جاتا ہے تو کبھی دوست۔ ایک دور میں زنا بالرضا کو گناہ کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو کسی زمانے میں اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ کبھی امریکہ میں شراب کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے تو کبھی اسے قانونی جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک سال زندگی سے مایوس مریض کو رضاکارانہ موت کے اسباب کی فراہمی کو قتل تصور کیا جاتا ہے تو دوسرے سال اسی کو "مرسی کلنگ" کا عنوان مل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کسی امر میں فیصلے کرتے وقت ذہن بہت سی باتوں کا اثر قبول کر لیتا ہے اور اصل ڈگر سے ہٹ جاتا ہے۔

اس میں مندرجہ ذیل عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۔ کسی کام کو ہاتھ میں لینے کے اثرات اس کا تعین کرتے ہیں کہ افراد کے لیے کیا چیز مفید ہے اور کیا مضر ہے۔ اس تصور کردہ نفع و نقصان کی نوعیت افراد کے مابین بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح ایک ہی شی کسی کے لیے تریاق تو کسی کے لیے زہر بن جاتی ہے۔

۲۔ انسانی جبلتیں اور اس کی جسمانی ضرورتوں کے باعث اس کے میلانات پسند اور ناپسند کا تعین کرتے ہیں یا میلانات بھی مختلف افراد میں مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ کسی معمولی سطح پر خون خرابہ گوارہ ہو تو دوسرے کو اس میں صریح گناہ نظر آتا ہو۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے صالح اور غیر صالح کے تعین میں عقل کی رہنمائی میں خطا کا بہت زیادہ امکان ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اعمال بذات خود اچھے یا برے نہیں ہوتے۔ کسی عمل کی اچھائی یا برائی کی تصدیق کرنے والے عوامل خود اس عمل کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں۔ یہی عوامل وہ مقصد ہوتے ہیں جن کے لیے کوئی عمل انجام دیا جاتا ہے۔ اسی لیے کسی انسان کو قتل کرنا بذات خود نہ اچھا ہے یا برا بلکہ جس مقصد سے اسے قتل کیا جارہا ہو وہ قتل کرنے کے عمل کی اچھائی یا برائی کو طے کرتا ہے۔ لہٰذا کسی اسلامی مملکت کے غیر مسلم باشندے کو مارنا برا ہے لیکن وہ غیر مسلم جارح جس نے اسلامی آراضی پر قبضہ کر کے اعلان جنگ کیا ہوا سے مار ڈالنا اچھا ہے۔

آج اسلامی ممالک میں عقل و ذہن کی رہنمائی قبول کرتے ہوئے جو فیصلے اختیار کیے جارہے ہیں اس میں بڑے تضادات ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال پاکستان میں عوامی سہولتوں کی نجی کاری ہے جب کہ رسول اللہ کا فرمان ہے۔ عوام کا تین چیزوں میں برابر کا حق ہے پانی، چراگاہ اور آگ۔ اسلام ان وسائل کو عوامی املاک تصور کرتا ہے اور ان کی نجی کاری حرام ہے۔ اس طرح سور سے اجتناب اس لیے نہیں کرتا ہے کہ وہ ایک نجس جانور ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ نماز اس لیے نہیں پڑھتا ہے کہ رکوع و سجود کی حالت میں الیکٹریکل ڈسچارج ہوتا ہے بلکہ اسلیے کہ اللہ کا یہ حکم ہے اور اس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور یہ سب اس لیے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی وحی عقل و ذہن کی محدود صلاحیت کی قید سے پرے ہے۔

سوال

ملی ٹائمز ماہنامہ جو پوری دنیا میں مشہور ہے اس کے ذریعہ غلامان رسول اور ان کے افکار اور ان کی جدوجہد اور ہندوستان میں ان کے اوپر ہونے والے مظالم کو بہت ہی اچھے انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کو جب ہم پڑھتے ہیں تو اس کے الفاظ ہمارے دل کو چھو لیتے ہیں اور ہمیں ملک وقوم کے لیے اپنی قربانی کے لیے اکساتے ہیں۔ تو کبھی اپنے مذہب کیلئے اپنے آپ کو مٹا دینا بھی پڑسکتا ہے اور ساتھ ہی کئی لوگوں کے مشکل سوالات جن کو ہم حل نہیں کرپاتے انکے حل بھی آپ دیتے ہیں اسلیے ہم آپکے شکر گزار ہیں اور اپنے ایک اہم سوال کا جواب طلب کرتے ہیں اور آپ سے امید ہے کہ اس کا اطمینان بخش جواب دیں گے۔

میری عمر ۱۹ سال ہے۔ اس وقت میں ایک کالج کی طالبہ ہوں۔ کالج کے دنوں ہی میں ہم کسی کو چاہنے لگے لیکن اچانک یہ ہوا کہ اس کی کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی طے پاگئی لیکن اس سے پہلے ہم اس سے اظہار نہ کرسکے تھے۔ اس کے بعد ہم کیا کریں یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اظہار کریں یا نہیں، یا اس کو اسی جگہ چھوڑ دیں لیکن وہ اس بات سے واقف ہوکر بھی انجان ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ شریعت کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن اگر وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے؟

(عثمان آباد سے بنت سلطانہ کے خط کی ہو بہو نقل)

جواب

آپ نے ملی ٹائمز کے دائرہ کار، اس کے مشن اور جذبے کو بہت اچھی طرح سمجھا جس کے لیے ادارہ آپ کا شکر گزار ہے۔ آپ نے اپنے بیان کو الجھا دیا ہے۔ پہلے آپ لکھتی ہیں کہ جس لڑکے کو آپ چاہتی ہیں اس کی شادی طے ہونے تک آپ نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا اور شاید اب آپکی حالت اسے معلوم ہوئی ہے لیکن وہ انجان سا بنا ہوا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لڑکے کو آپ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جہاں اس کی شادی طے ہوئی ہے وہ اسے منظور ہے۔ اس کی شادی جیسا کہ ہمارے یہاں عموماً ہوتا ہے، ماں باپ نے طے کی ہوگی اور اسے اپنے والدین کے انتخاب پر اطمینان اور بھروسہ ہے

حیرت ہمیں اس بات پر ہے کہ ملی ٹائمز کی پسندیدگی کے سلسلے میں آپ نے ایک طرف سنجیدگی سے اسلامی جذبے کا اظہار کیا ہے لیکن زندگی کے معاملے میں بڑی نادانی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کے الفاظ سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ یکطرفہ ہے اور اس لڑکے سے محبت کا اظہار کرنے کی ہمت کبھی آپ میں پیدا نہ ہوسکی اور جب ایسا تھا تو ایک دوسرے کے شریک حیات بننے کی بات چیت کی نوبت کیونکر آئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح کے معاشرے سے ہمارا آپ کا تعلق ہے اس میں ایسا ممکن بھی نہیں ہے کہ انیس سال کی لڑکی اور لڑکا خود مختارانہ طور پر زندگی کے اہم فیصلے کرلیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے معاشی اور سماجی استحکام کی جو کہ ان دونوں کو حاصل نہیں رہتا اور پھر ان کے شعور میں پختگی بھی اس وقت اتنی نہیں آپاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ چاہے جانے اور چاہنے کا جذبہ فطری طور پر اس سے بھی چند سال قبل شروع ہوجاتا ہے لیکن یہ جذبہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کے احساس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ چاہنے کا مطلب کسی کی آرزو کرنا ہے اور اس آرزو کی تکمیل کا واحد طریقہ اسلامی نقطہ نظر سے ازدواجی رشتے میں بندھنا ہی ہے اور اس کی امید آپ کے لکھنے کے مطابق باقی نہیں ہے اس لیے اب یہ مسئلہ آپ اپنے والدین پر چھوڑ دیں۔ شریعت کی رو سے آپ دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا درست نہیں ہے۔

میرے شوہر کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دیتے ہیں، میں کیا کروں؟

سوال

میری شادی ایک نیک خصلت اور دیندار مرد سے ہوئی۔ میرے شوہر ہر طرح میرا خیال رکھتے ہیں اور کسی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ بس ایک خرابی ہے جس سے میں متاثر ہوسکتی ہوں، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ بہت بخل برتتے ہیں اور باوجود اسکے کہ میری ساس ضرورت مند رہتی ہیں اور شوہر خاصے خوشحال ہیں وہ اپنی والدہ کو کوئی چیز یا روپیہ پیسہ نہیں دیتے۔ میرے کبھی ٹوکنے پر انکا جواب یہی ہوتا ہے کہ میری ساس کو جو نفقہ ملتا ہے وہ انکی ضروریات پوری کرنے کیلئے کافی ہے جبکہ میرا اصرار یہ رہتا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنی والدہ کو کچھ نہ کچھ دیتے رہیں جس پر وہ کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میری ساس کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ انکے بیٹے نے جوان کی مدد سے ہاتھ کھینچ رکھا ہے اس کا سبب میں ہوں اور صرف میں، حالانکہ اللہ گواہ ہے کہ اس میں میں کسی طرح شریک نہیں ہوں۔ میں سخت مشکل میں ہوں کہ اپنے شوہر کو اس پر کیسے آمادہ کروں کہ وہ اپنی ماں کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہیں اور ساس کو اپنی بے گناہی کا یقین کیسے دلاؤں؟ فاطمہ بی۔ نئی دہلی

جواب

آپ نے اپنے شوہر کی والدہ کے لیے جس ہمدردی اور رحمدلی کا اظہار کیا ہے وہ واقعی قابل قدر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ دیگر مسلم بہنوں کے دلوں کو بھی ایسے ہی جذبات سے بھردے کہ وہ اپنے شوہر کے ماں باپ اور اس کے گھر والوں کا احترام اور ان کی ضروریات، آرام وتکلیف کا خیال اسی طرح کریں جیسے وہ خود اپنے عزیزوں کے لیے کرتی ہیں۔ انسان اگر نیک ارادے اور نیت سے کوئی عمل کرتا ہے تو اس میں یقیناً کامیابی ملتی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اسی لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے شوہر کو برابر یہ نصیحت کرتی رہیں کہ وہ اپنی والدہ کی طرف سے بے توجہی نہ برتیں اور ضعیفی کی حالت میں کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے انھیں ذہنی اذیت پہنچے۔ اولاد کی مالی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو اگر وہ اپنے والدین اور خصوصاً ماں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے تو وہ اس کے لیے باعث برکت بنتا ہے اور جو مشقت ماں نے اسے پالنے پوسنے میں اٹھائی ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ان کا احساس کرے اور اس سلسلے میں اللہ کا یہ فرمان پیش نظر رہے۔

یسئلونك ماذا ینفقون قل ماانفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتامی والمساکین وابن السبیل وماتفعلوا من خیر فان الله به علیم

آپ اپنے شوہر کو یاد دلاتی رہیں کہ والدین کے ساتھ بھلائی کرنا جہاد اور بہت سے نیک اعمال سے افضل ہے۔ مسلمان نوجوان کو یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اگر اس کے والد اس کی ماں کے اخراجات پورے کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور خرچ دیتے رہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ بیٹے کی کمائی اور مال ومتاع میں ماں کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر وہ کچھ مانگے تو اسے نہ دیا جائے۔ اسے چاہیے کہ اپنے بیوی، بچوں اور دیگر افراد کی کفالت کے ساتھ ساتھ ماں کے آرام وتکلیف کا بھی خیال رکھے۔ آپ یہ بھی کرسکتی ہیں کہ آپ اپنے شوہر سے اپنے لیے کوئی چیز یا رقم لے کر ساس کے

حوالے کر دیں، اس طرح ساس کو آپ کی طرف جو بد گمانی ہے وہ دور ہو سکتی ہے۔

سوال میری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اس دوران میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گذارتی رہی ہوں۔ ہمارے یہاں دو بچے ہیں جو اسکول جانے لگے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک بچی کی بھی ولادت ہوئی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ میرے شوہر کے مزاج میں وہ پہلے جیسی بشاشت نہیں ہے۔ پہلے تو وہ اپنے کام سے فراغت کے بعد جو وقت ملتا تھا میرے ساتھ گذارتے تھے لیکن اب ادھر ادھر گھوم کر گذار دیتے ہیں اور اگر گھر جلدی بھی آجاتے ہیں تو زیادہ تر سوتے رہتے ہیں اور بات چیت بھی بڑی بے دلی سے کرتے ہیں، یہاں تک کہ کھیلتے کھیلتے بچے اگر آپس میں الجھ جاتے ہیں تو بھی وہ خاموش ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے اور میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ اچانک اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ حلیمہ بی

جواب ازدواجی زندگی کو پائیدار اور کامیاب بنائے رکھنے کے لیے صبر، تدبر اور زوجین کے درمیان تعاون ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھنے، آپسی احترام اور حقوق کی ادائیگی میں ان کی مددگار بنتی ہیں، ورنہ بعض اوقات سرسبز و شاداب خانگی زندگی خزاں کی نذر ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنے لگتے ہیں اور بد گمانیاں سر ابھارنے لگتی ہیں۔ تدبر اور حکمت سے کام لیتے ہوئے آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیتی رہیں۔ یعنی خود اپنا محاسبہ کرتیں کہ زندگی جس ڈھرے پر چل رہی ہے اس میں سب کچھ ٹھیک اور درست ہے یا کہیں سے کوئی جھول، کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے دو بچے ہیں اور تیسرے بچے کی ولادت ابھی ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خانگی مصروفیات میں اضافہ ہوا ہے۔ پہلے آپ کے شوہر خالی اوقات آپ کے ساتھ گھر میں گذارتے تھے یا کہیں آپ کو باہر گھمانے لے جاتے تھے، اب ایسا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے پہلے وہ آپ کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی فرمائش کرتے ہوں لیکن آپ کو بچوں کی طرف بہت زیادہ منہمک پا کر ایسی فرمائش نہ کر پاتے ہوں لیکن اندر ہی اندر اس محرومی کا اثر ان کے ذہن و دل پر پڑ رہا ہو۔ اس طرح تیسرے بچے کی آمد کے بعد سے آپ پر دوہری ذمہ داری آگئی ہے یعنی بچوں کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ شوہر کی دلجوئی بھی۔ اس بچے کے اضافے اور مصروفیات کے بڑھ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ شوہر کے لیے آپ میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے اس لیے اس کی رفاقت کے اہتمام پر آپ کوئی توجہ نہ دیں۔

اب آپ یہ کریں کہ جب آپ کے شوہر اپنے کام نمٹا کر گھر آئیں تو آپ خاص طور پر اپنا حلیہ وغیرہ ٹھیک کر کے ان کے پاس آکر تھوڑی دیر بیٹھیں، روزمرہ کے مسائل وغیرہ پر ہلکی پھلکی بات چیت کریں تو اس توجہ کا ان پر اچھا اثر ہوگا۔ یہ شکایت آپ ہرگز نہ کریں کہ آپ کو تو کبھی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہم سے ہنسیں، بولیں بلکہ یہ کہ واقعی بڑی محرومی کی بات ہے کہ بچوں سے متعلق کاموں کی مصروفیت سے سابقہ معمول بگڑ گیا۔ ممکن ہے شوہر کی طرف سے بھی جواباً کوئی ایسا ہی عذر سننے کو ملے۔ اس طرح اگر ذہن پر کوئی بوجھ ہوگا تو دور ہو جائے گا۔ جہاں زوجین کو ایک دوسرے کے سامنے اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا وہاں اعتماد کی فضا بھی قائم نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک طرح کی گھٹن کا راج رہتا ہے۔ مثلاً بعض شوہر جو کم گو ہوتے ہیں وہ بیوی کی موجودگی میں بھی گھر میں محض ٹیلی ویژن دیکھ کر یا رسائل اور ناول پڑھ کر وقت گذار دیتے ہیں۔ نہ بیوی کو گھریلو امور میں کوئی مشورہ دیتے ہیں نہ کسی خوبی پر اس کی تعریف کرتے ہیں بلکہ اس سے ایک مشینی عمل کی امید رکھتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خواہش انسان میں فطری طور پر پائی جاتی ہے اور عورت میں یہ خواہش کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔

سوال میری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں۔ ہمارے ایک ہی بچہ ہے اور وہ بھی ذہنی طور پر سست ہے۔ میں اس مرض کی نوعیت کو سمجھنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ موروثی مرض ہے، اگر ایسا ہے تو مجھے ڈر ہے کہ اس کے بعد اگر میرے یہاں کوئی بچہ ہوا تو وہ بھی اسی عارضے میں مبتلا ہو جائے گا؟ نسیمہ بیگم۔ ممبئی

جواب ذہنی کمزوری کے کئی درجے ہیں اور ان درجوں کا تعین عقل پیمائی کے مختلف تجربوں سے ہوتا ہے جو ذہنی طور پر کمزور افراد پر کیے جاتے ہیں۔ ایک سطح تو وہ ہوتی ہے جو متاثر شخص کی مخصوص تربیت سے رفع ہو سکتی ہے اور اس میں فہم کا مادہ ۵۰ سے ۶۹ فیصد تک ہوتا ہے۔ اسی طرح ۳۰ سے ۵۰ فیصد تک کی فہم بھی قابل تربیت ہوتی ہے لیکن کمترین درجے یعنی ۳۰ فیصد سے نیچے کی حالت میں اس کی تربیت اور اصلاح ممکن نہیں ہوتی۔ یہ بات کہ کسی بچے میں عقل و فہم کس درجے کی ہے اس کی پیدائش کے وقت ہی معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی بچے کا سر بہت بڑا ہے یا غیر معمولی طور پر چھوٹا ہے تو یہ عقلی کمزوری کی علامت ہے۔ بعض حالات میں عقلی کمزوری کا اندازہ ہو جانے پر بھی بچے کی مختلف طرح کی جانچ کرانی پڑتی ہے جس کا تعلق اس کے اعصابی نظام، دماغ، آنکھ، ناک، کان اور بولنے کی صلاحیت سے ہوتا ہے۔

عقلی کمزوری کی تین اقسام بیان کی جا سکتی ہیں۔ ایک وہ جو پیدائش سے پہلے واقع ہو جاتی ہے۔ دوسری وہ جو پیدائش کے دوران ہو سکتی ہے اور تیسری قسم وہ ہے جو پیدائش کے بعد رونما ہوتی ہے۔ پہلی قسم کا تعلق دوران حمل ماں کی صحت سے ہے یعنی یہ کہ اگر جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبارات سے صحت مند ہے تو بچے کی بھی صحت مندی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اگر ماں کی صحت کمزور ہے تو بچے کی پیدائش قبل از وقت ہو جاتی ہے اور اس سے خود طرح طرح کے امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔ اگر ماں تمباکو نوشی اور شراب نوشی کی عادی ہے تو اس سے بھی بچے کی دماغی صلاحیت متاثر ہوگی۔ ماں اور بچے کے خون کے گروپ میں تضاد سے بھی یہ خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً ماں کا بلڈ گروپ نیگیٹو ہے اور بچے کا پازیٹیو یا حمل کے شروع کے مہینوں میں ایکسرے کروایا گیا تو اس سے بھی ذہنی اور دماغی خلل کا خطرہ بہت رہتا ہے۔

دوران ولادت اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بچے کے دماغ کو آکسیجن کی مطلوبہ مقدار فراہم ہونا بند ہو جائے، اس کی وجہ تنفس میں رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ بچپن میں پیدا ہونے والی عقلی کمزوری کا سبب تھائی رائڈ گلینڈ کے فعل میں خرابی ہو سکتی ہے اسی طرح بھاری دھاتوں مثلاً رانگا اور جست سے واقع ہونے والی فضائی آلودگی سے بھی بچے جلد متاثر ہوتے ہیں اور ان کی دماغی صحت نسبتاً اس کی زد پر زیادہ رہتی ہے اور کبھی یہ خلل موروثی اسباب سے بھی ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ موروثی اسباب اگلی نسل تک منتقل ہوں۔

ان باتوں کی روشنی میں آپ اپنے حالات کا جائزہ لیں اور بچے کی طبی جانچ ضرور کرائیں جس سے اس کی عقلی کمزوری کے درجے کا تعین ہو سکے۔ ▭

سماعت سے معذور بچوں کے لئے امید کی کرن

بچوں میں سماعت کی صلاحیت کی کمی یا ایسی حالت پیدا کرنے والی کسی بیماری کی ابتدائی عمر میں تشخیص بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ زبان سیکھنے اور بولنے کی صلاحیت کے ارتقاء کا اس پر بڑی حد تک انحصار ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے شیر خواروں اور بچوں میں سماعت کی صلاحیت کی کمی یا بہرے پن کی کمی روایت عملی تکنیکوں کے ذریعے نشاندہی خاصا مشکل اور دیر طلب کام ہے۔ اور پھر یہ طریقہ پوری طرح بھروسے کے قابل بھی نہیں ہے۔ بچوں میں بہرے پن یا سماعت کی کمی کا اندازہ کرنے کے لیے ابھی ایک نیا طریقہ دریافت ہوا ہے جسے Otoacoustic Emission Testing (OET) کہتے ہیں۔

کیا آپ کا بچہ اونچا سنتا ہے؟ محض بچے کے چہرے کی طرف دیکھ کر یہ بتا دینا ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ ماؤں کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچے کے جسم میں پلتے ہوئے کسی عارضے کا احساس کر سکیں اور جب انھیں معلوم ہوتا ہے تو کافی تاخیر ہو چکی ہوتی ہے اور ابھی تک سماعت کی کمی کا اندازہ کرنے کا واحد طریقہ یہی رائج رہا ہے کہ بچے کی سماعت کی پیمائش کی جائے اور اس پیمائش میں سماعت کے دوران بچے کے رد عمل کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

ہمارے یہاں ہر ایک ہزار میں تین بچے بہرے پیدا ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ سماعت کا کوئی عارضہ لے کر۔ ابتدائی مرحلے میں مرض کی تشخیص ہو کر مناسب علاج ہو جائے تو بچہ ایک معمول کی زندگی گذارنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ امریکہ میں ۹۸ فیصد بچوں میں شدید درجے کے ثقل سماعت کی تشخیص ہو جاتی ہے جب کہ ہندوستان میں یہ شرح محض ۲۰ فیصد ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں اس مسئلے کی طرف سے عوامی بیداری خاصی کم ہے اور کم عمری یعنی بچپن میں سماعت کی کمزوری کی صحیح تشخیص کرنے والے آلات کی بھی بہت کمی ہے۔

نئے ٹیسٹ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ کان میں آواز نہ صرف پروسس ہوتی ہے بلکہ ایک صحت مند کان خود بھی آوازیں پیدا کرتا ہے جسے سائنسی اصطلاح میں Otoacouistic Emission کہا گیا ہے اور جن کی شدت خاصی کم ہوتی ہے۔ ان آوازوں کا انکشاف کیمپ نام کے ایک سائنس داں نے ۱۹۷۸ میں کیا۔ اس دریافت میں کامیابی کا سہرا بڑی حد تک نچلی سطح کی آوازوں کو گرفت میں لینے والی طاقتور سگنل پروسسنگ تکنیک کی ایجاد کے سر ہے۔

ہر اعتبار سے صحت مند انسان کے کان سے Otoacoustic Emission پیدا ہوتے ہیں لیکن اگر کسی شخص کی سماعت میں ۳۰ سے ۴۰ ڈیسی بل تک کی کمی واقع ہو جائے تو یہ عمل رک جاتا ہے۔ انہی سماعتی لہروں کا اخراج نہ ہونے سے بہرے پن یا اونچا سننے کا عارضہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ اخراج فطری بھی ہو سکتا ہے اور مصنوعی بھی۔ فطری اخراج کو سماعت کی صلاحیت کی پیمائش کے مقصد سے طبی جانچ میں کام میں نہیں لایا جاسکتا جب کہ مصنوعی اخراج کی تجرباتی اہمیت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سماعتی لہریں مصنوعی طور پر کان میں کسی طرح اٹھائی جاتی ہیں اس کے لیے کبھی تیز ہوتی اور کبھی مدھم ہوتی آوازوں کے ایک سلسلے کو کان سے گذارتے ہیں، جیسے قمقمے جلتے بجھتے ہیں اور ہر بار کے عمل میں کان سے خارج ہونے والی لہروں کو پروب مائیکروفون کے ذریعے ناپ لیا جاتا ہے۔ ہر کمپیوٹر کی مدد سے اس طرح کے متعدد اخراجات کا اوسط نکالا جاتا ہے تاکہ شور کے اثرات کم کیے جاسکیں۔

سماعتی لہروں کے اخراج کی پیمائش کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ مختلف فری کوئنسیوں کی دو آوازیں متعلقہ شخص کے کان سے گذاری جاتی ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ سننے کے عمل کے دوران کتنا distortion ان

میں آتا ہے۔ فنی اعتبار سے آواز کے مسخ ہونے سے مراد کوئی ایسی چیز آواز کے دوبارہ پیدا کرنے میں آجائے جو کہ اصل آواز میں نہیں تھی۔ دونوں کے فرق کو اور سی ڈی میوزک اور کسی کار میں لگے ہوئے ریڈیو کی آواز کے موازنے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ دراصل یہی اضافی یا بھرتی کی آوازیں ہی distortion کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان کا کان ایک طرح کا پرانا ریڈیو ہی تو ہے۔ یہ اپنی جگہ مکمل نظام نہیں بلکہ اس میں distortion پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس distortion سے وجود میں آنے والی چیزوں کو ناپنے کے لیے کان سے دو مختلف لیکن باہم مربوط فری کوئنسی کی آوازوں کو گذارا جاتا ہے پھر انھیں پروب مائیکروفون سے سن کر distortion product کی فری کوئنسی کو ریاضی کے فارمولے کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے تاکہ کمپیوٹر سسٹم دیگر فری کوئنسیز سے تشکیل پانے والے شور کو ختم کرنے کے لیے اپنے فلٹر کو صحیح جگہ پر لگاسکے۔

سماعت کی اسکریننگ کے کئی طریقے حال ہی میں سامنے آئے ہیں لیکن وہ سب آس پاس کے شوروغل سے متاثر ضرور ہوتے ہیں اور اسی لیے عملاً ان کا استعمال آسان نہیں رہ جاتا۔ اوا ے ای کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں بچوں کی سماعت کی صلاحیت کی پیمائش ایک منٹ کے اندر ہوجاتی ہے چاہے ان کی عمر تین دن ہی کیوں نہ ہو۔ ایک اور فائدہ اس طریقے کا یہ ہے کہ فیکٹری کے ماحول میں کام کرنے والے افراد کی اسکریننگ اس سے بہت آسان ہوجاتی ہے۔

بچوں میں سماعت کی مکمل صلاحیت کی علامات ان کی عمر کے اعتبار سے حسب ذیل ہوسکتی ہیں۔

- پیدائش سے چار ماہ کی عمر تک سونے میں بچہ اچانک شور پر چونک جائے اور چیخنے لگے۔
- چار ماہ کی عمر میں بچہ ان آوازوں کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے جن کا مخرج اس کی آنکھ سے اوجھل ہو۔ پانچ سے چھ ماہ تک طرح طرح کی آوازیں نکالتا ہے۔ ساتویں ماہ میں نظر نہ آنے والی آوازوں کی طرف وہ براہ راست رخ کرنے لگتا ہے۔
- سات سے نو ماہ کی عمر تک وہ نہ صرف دور سے آتی آوازوں پر براہ راست متوجہ ہوگا بلکہ یہ بھی جاننے کی کوشش کرے گا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے
- نو سے تیرہ ماہ تک وہ اس آواز کی نقل کرنے کی بھی کوشش کرے گا اور ماں بابا، بوبو جیسی آوازیں بھی نکالے گا۔
- تیرہ سے چوبیس ماہ کے دوران اگر اسے کسی دوسرے کمرے سے پکارا جائے تو اسے سننا چاہیے گا اور اس کے جواب میں وہ کوئی آواز بھی نکالے گا اور اس کی آواز بھی معمول کے مطابق ہوگی۔

بقیہ نئی کتاب

یہ خیال کرتا ہے کہ یہ تاریخی مسئلہ ہے۔ عرب کے حساب سے اسرائیل کا قیام ایک غلطی تھی لیکن دیر سویر اس غلطی کی تلافی کرلی جائے گی۔ مؤلف نے عربوں کی ترقی کی شرط اسرائیل کے ساتھ مصالحت سے لگائی ہے جس کی وجہ سے وہ امریکی جوان کو ٹیلی ویژن میں بات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور "یو ایس نیوز" اخبار میں ان کو پڑھتے ہیں، ان کی طرف سے ان کو شرف قبولیت حاصل ہے۔

فواد عجمی امریکہ میں مقیم ایک ایسے عرب ادباء میں سے ہیں جو امریکی کاز کے لئے اپنی حمایت اور جوش و جذبہ میں منفرد مقام رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی اس کتاب میں یہ لکھتے ہیں کہ صدام حسین کے ساتھ امریکا کی جنگ نے امریکا کے قدیم تناقض کو واشگاف کردیا ہے۔ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ دور دراز ملکوں میں بھی اپنے مصالح و منافع کی چیزوں کی حمایت اور نگرانی و دیکھ بھال کرے اور اس پر کڑی نظر رکھے لیکن ان ملکوں اور ان کے باشندوں پر نگاہ رکھنے کے لئے وہ کبھی بھی طاقت نہیں رکھ سکتا۔

مؤلف یہ بھی کہتے ہیں کہ ان تمام ممالک کے باشندوں نے ان تمام غیر ملکی لوگوں کو پہچان لیا ہے جو ان کے یہاں آئے تھے اور جہاں سے آئے تھے وہاں پھر چلے گئے۔ لیکن یہاں پر مؤلف کے اس تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے اور یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا مؤلف کی رائے بدل گئی ہے؟ یا کویت سے عراق کو نکالنے کے آٹھ سال بعد امریکی رول ادا کرنے کے لئے ان کی قوت جواب دے چکی ہے؟

اپنی کتاب میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ جنوبی لبنان میں ایک مسلم شیعی خاندان میں ان کی پرورش و پرداخت کے باوجود وہ دین کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں رکھتے اور طرفہ یہ ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں سیکولرازم کے علمبردار ادباء کا جو رحجان اور زاویہ فکر ہے اسی فکر کے مطابق وہ لکھتے بھی ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فکر اسلامی کو لغو قرار دینے اور اس کو کمزور کرنے کے ساتھ ساتھ گذشتہ پچاس سالوں کے درمیان عربی فکر کو منظر عام پر لانا اور اس کا پیش کیا جانا ممکن ہوسکا؟ یا اسلام پرستوں کے ساتھ جو اختلاف پائے جاتے تھے وہ اختلاف ان اسلام پرستوں کے فکر کو کمزور کرنے سے نجات دلاسکا۔

افسوس کہ ہم آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم مسئلہ پر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی میرے ذہن کو اکثر پریشان کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دینی کتابوں میں پانی پینے کے آداب کے سلسلے میں بڑی سختی برتی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی نہیں پینا چاہیے۔ اگر بھول سے پی بھی لے تو الٹی کر کے نکال دیا جائے۔ لیکن دہلی اور دیگر بڑے شہروں میں جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو کھڑے ہو کر ہی پینا پڑتا ہے کیونکہ بس اسٹیشن اور اس جیسی بھیڑ بھاڑ والی جگہوں پر بیٹھنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔ براہ کرم یہ بتائیں کہ کیا کھڑے ہو کر پانی پینے سے جسم کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچتا جو اتنی سختی برتی گئی ہے؟

(محمد اکبر۔ نارا ستا، نئی دہلی)

جواب چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور و فکر کرنا سنجیدہ لوگوں کی علامت ہے۔ اسلام کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اسی لیے دینی کتابوں میں آداب معاشرت کے تحت کھانے پینے کے آداب بھی بتائے گئے ہیں۔ ان آداب میں یہ بھی ہے کہ کھانا اور پینا جو اہم ترین انسانی اعمال ہیں بیٹھ کر انجام دئے جائیں نہ کہ چلتے پھرتے یا کھڑے اور لیٹے ہوئے کھایا پیا جائے۔ تاہم اتنی سختی بھی نہیں برتی گئی ہے کہ اگر بھولے سے ایسا ہو جائے تو کھڑے ہو کر کھائی ہوئی چیز یا پیے گئے پانی کو قے کر کے نکال دیا جائے۔ یہ بات اس وجہ سے بھی سمجھ میں آنیوالی نہیں ہے کہ روزے کی حالت میں اگر کوئی شخص بھولے سے کھا پی لے تو اس کیلئے بھی یہ حکم نہیں ہے کہ وہ قے کر کے غذا یا پانی باہر نکالے۔ یہ آپ نے بجا طور پر محسوس کیا ہے کہ دہلی جیسی جگہ میں جہاں لوگوں کا سابقہ اکثر بازار، ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹاپ وغیرہ سے رہتا ہے یہ ممکن نہیں کہ بیٹھ کر پانی پینے کا اہتمام پابندی سے ہوتا رہے یہ ضرور ہے کہ جہاں بیٹھ کر کھانا یا پینا ممکن ہو تو وہاں کھڑے رہنے پر اصرار نہ کیا جائے اور کوشش یہی ہو کہ اسلامی آداب کے مطابق عمل کیا جائے۔

اس سلسلے میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جوں جوں انسانی عقل ارتقاء کی منزلیں طے کرتی جارہی ہے اس بات کے ثبوت فراہم ہوتے جارہے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی تعلیمات میں جو حکمت پوشیدہ ہے اس میں انسانی مفاد ہر اعتبار سے پیش نظر رہا ہے۔ مثال کے طور پر کھانے پینے کے لیے بیٹھی ہوئی حالت مناسب ترین ہے۔ آپ لیٹ کر کھانے یا پینے کی کوشش کریں تو اس میں آپ کامیاب تو ہو جائیں گے لیکن خود یہ محسوس کر لیں گے کہ اس عمل میں آپ کو خاصی دشواری ہو رہی ہے۔ مثلاً نگلنے میں کچھ رکاوٹ ہوگی، گلے میں پھندا لگنے لگے گا، لقمہ یا گھونٹ اٹکے گا اور پانی منہ کے کنارے سے بہہ بھی سکتا ہے۔ غرضیکہ خاصی بدہیئتی کی نوبت آسکتی ہے۔ اسی طرح چلنے پھرنے کی حالت میں آپ پانی پی کر دیکھیں تو نسبتاً زیادہ پریشانی ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بیٹھی ہوئی حالت میں انسانی جسم کو زیادہ آرام ملتا ہے اور چونکہ کھانے پینے کے عمل کا مقصد جسم کو توانائی دینا ہے تو یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب غذا اور پانی جسم کو آرام کی حالت میں حاصل ہوں۔

سوال قریباً دو دہائیوں سے ہمارے خطے خصوصاً میرے جسم (شاید محلہ) کے اطراف میں بدچلن لوگ لگے ہوئے ہیں اور قدم قدم پر رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں۔ نیز ہماری سبھی جائز چیزوں سے ہمیں محروم کرتے جارہے ہیں اور اس کی جگہ پر ناجائز چیزیں ہمیں سپلائی کرتے ہیں جس میں دوکان کو توڑ دیا جانا اور چار۔ بچوں اور بیوی کو اغوا کر لیا جانا قابل ذکر ہے۔ مجبوراً میں نے بیوی کو طلاق دے دیا ہے اور۔ بچوں کو عاق کر دیا ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ عقد ثانی کر لوں۔ لیکن لوگ کرنے نہیں دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں بنا غلط خصوصا بدچلن بنے کام چلنے والا نہیں ہے۔ ہر شخص کو بلیک میل کا شکار ہونا ضروری ہے۔ یہ دنیا کا بالکل نرالا معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں شادی کے لیے پہلے بھی ایک کارڈ آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ براہ مہربانی اپنے روحانی عمل سے اس کا سدباب کرنے کرانے کی زحمت کریں گے، عین نوازش ہوگی۔ ایسا معاملہ نہ آپ کی زندگی میں آیا ہوگا نہ آئندہ آئے گا۔

(ناصر علی انصاری۔ منڈی انسپکٹر رسڑا، بلیا)

جواب آپ نے درست تحریر فرمایا ہے کہ ایسا معاملہ نہ ہماری زندگی میں آیا ہوگا اور نہ آئندہ آئے گا۔ ہماری دعا ہے کہ ایسا کوئی معاملہ آئندہ نہ آئے۔ من و عن آپ کے الفاظ کی روشنی میں آپ کے مراسلے کا جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ یا تو آپ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے یا آپ ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے اطراف میں جو بدچلن لوگ رہتے ہیں وہ کون سی ناجائز چیزیں سپلائی کر رہے ہیں اور کیسے سپلائی کر رہے ہیں اور آپ کی کون سی جائز باتیں جن پر عمل کرنے سے آپ کو روکا جارہا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان کے پیش نظر یہ سوال آپ سے کیا جا سکتا ہے کہ جائز اور ناجائز کا آپ نے کیا تصور قائم کر رکھا ہے۔ آگے آپ لکھتے ہیں کہ دوکان کا توڑا جانا اور چار۔ بچوں اور بیوی کو اغوا کیا جانا قابل ذکر ہے۔ دوکان آپ کی توڑی گئی ہو یا آپ کے پڑوسی کی، واقعی باعث افسوس ہے لیکن اغوا شدہ۔ بچوں اور بیوی کی مظلومیت کا احساس

باقی صفحہ ۴۳ پر

جب عرب فکر کو اسلام سے علیٰحدہ کرنے کی مہم چل پڑی

عرب نژاد امریکی فواد عجمی کی نئی کتاب عرب اسلامی ورثے پر شرمندگی کا اظہار بن کر رہ گئی ہے

کتاب : عرب کے خوابوں کا محل

مؤلف : ڈاکٹر فواد عجمی

یہ کتاب پچھلے پچاس سالوں کے درمیان عرب ادباء جیسے بلغد حیدری، خلیل الحاوی، نزار قبانی، نجیب محفوظ، ادونیس اور بدر شاکر السیاب وغیرہ کے افکار و نظریات کی مظہر ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے ان پچاس سالوں کی عربی فکر کی تحریک کی متابعت و موافقت کی ایک جامع اور مکمل تصویر کشی کی ہے۔ اس موضوع پر امریکی ادباء اور عام امریکی لوگوں کی معلومات کے لئے اکادمی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مؤلف کی شہرت اس کی کتاب کی نشرواشاعت میں بھرپور ممد و معاون ثابت ہوگی۔

مصنف لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کا نام عرب شہریت یافتہ لورنس کی کتاب "حکمت کی سات بنیادیں" سے اخذ کیا ہے جس میں لورنس نے کہا تھا کہ میرا مقصد ایک نئی امت کی تعمیر و ترقی ہے اور عربوں کو ان کے وطنی افکار و خیالات کے خوابوں کے محل کی تعمیر میں ایک موقع فراہم کرنا ہے۔

لورنس کی اہمیت جو اہل یورپ کے یہاں پائی جاتی ہے اس کے برخلاف مؤلف نے عربوں کے نزدیک اس کی اہمیت کو کم کر کے پیش کیا ہے۔ مؤلف لکھتے ہیں کہ لورنس ان کے ممالک میں ایک خاص وقت میں اور ایک خاص مصلحت کی خدمت کے لئے آیا تھا۔ بہرحال مصنف نے عرب وطنی و فکری تحریک کی متابعت میں اپنی کتاب "عرب کے خوابوں کا محل" کے لکھنے میں لورنس کے افکار و نظریات کو کشید کیا ہے۔ البتہ وہ اس کتاب کے وصف بیان کرنے میں یہ کہتے ہیں کہ ان خوابوں میں سے اکثر خواب انجام دئے جا چکے ہیں

جہاں تک لورنس کا سوال ہے تو وہ عرب وطنیت اور غیر مملکت اسرائیل سے عرب کے تعلقات کے موضوع کو اپنا محور بناتا ہے اور اس پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ لورنس ایسے زمانے میں تھا جب عرب قلق و اضطراب کے دور سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف مراحل سے منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ ترکوں کی حکومت کے تحت رہیں یا برطانیہ و فرانس کے؟ عربوں کو آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کے قلق و اضطراب کا ایک ایسا مرحلہ پیش آیا جو کہ کتاب میں شامل ہے۔ آیا وہ مشرقی بلاک میں شامل ہوں یا مغربی بلاک میں؟ سیکولرازم کے ساتھ ہوں یا بنیاد پرستی کو اپنائیں؟

یہ کوئی ایسی کتاب نہیں جو حریت کے موضوع کی اہمیت سے الگ ہو۔ اس کتاب کے اندر ڈکٹیٹرشپ خاص کر صدام حسین کے آمرانہ نظام کے خلاف زبردست تنقید کی گئی ہے۔ لیکن مؤلف نے ان تمام تر تنقید کے باوجود بھی اپنے لئے امریکی نیشنل بننا پسند کیا اور بعد کے آنے والے تمام سال انہوں نے امریکہ ہی میں گزارے۔

مؤلف کہتے ہیں کہ انہوں نے کتاب کے اندر ایک ایسے مرحلے کو پیش کیا ہے کہ جس مرحلے میں ایک ایسی نسل کی تربیت کی گئی تھی جس کو "عربی نسل" کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ وہ لگ بھگ پچاس سال پہلے جنوبی لبنان کے ایک گاؤں میں اپنی جائے پیدائش کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں اور عرب قومیت کے افکار اور مصری صدر جمال عبدالناصر کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جو شخص مؤلف کو امریکی ٹیلی ویژن میں بات کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ انہوں نے اپنا نظریہ بدل دیا ہے۔ خاص طور سے جب مؤلف مشرق وسطی کے تعلق سے امریکی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ کیا وہ امریکی نگراں کو دکھانے کے لئے ایسا کرتے ہیں؟

مؤلف، عرب ادباء کے ان نظریات کو بھی نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو اسرائیل کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں لیکن وہ خود بھی عرب اسرائیل کے تعلقات کی بابت رقمطراز ہیں "یہ ضروری ہے کہ قدیم عناد و دشمنی کے مراحل کو طے کرتے ہوئے عرب اپنی ترقی و تعمیر اور خود نئی چیزیں پیدا کرنے اور خود کفیل بننے کے لئے کارنامے انجام دیں" ان کا کہنا ہے کہ بعض ادباء میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسرائیل کو سرے سے تسلیم کرنے سے ہی انکار کرتی ہے۔ ان تسلیم نہ کرنے والوں کے دو گروپ ہیں۔ پہلا یہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ اسرائیل کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اب اس کے بعد فلسطین و بیت المقدس کو آزاد کرانے کے لئے کبھی یہ وقت نہ آسکے گا۔ دوسرا گروپ وہ ہے

باقی صفحہ ۴۸ پر

سابق دارالاسلام ہندوستان پر گذشتہ پچاس برسوں میں بیتے دردناک لمحوں کی خونچکاں داستان
اب کتابی شکل میں شایع ہوگئی ہے

ہندوستانی مسلمان

ایام گم گشتہ کے پچاس برس

قائد ملی ڈاکٹر راشد شاز

کے قلم سے

☐ ہندوستانی مسلمان سیکولر ڈیموکریسی کے جہنم میں کیسا محسوس کرتے ہیں ☐ گذشتہ پچاس برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں نے کیا کھویا؟ کیا پایا؟ ☐ سیکولرازم کی اس اذیت گاہ سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ ☐ اس سرزمین میں اللہ اور اس کا رسولؐ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ☐ سابق دارالاسلام کو دوبارہ دارالاسلام بنایا جانا کیسے ممکن ہے؟ ☐ ملی اسلامی زندگی کی ازسرنو تعمیر کا طریقہ کیا ہے؟ ☐ قائد ملی کی فکر کو سمجھنے کے لئے ایک جامع دستاویز ☐ نظام کفر کی معصیت سے نکل کر نظام عدل کی رحمت کے متلاشیوں کے لئے ایک انقلاب انگیز کتاب جس کے پڑھنے کے بعد آپ ایسا محسوس کریں گے گویا

جو تھا وہ نہیں ہے جو نہیں تھا وہ ہے

قیمت مجلد ڈھائی سو روپئے

انفرادی خریداروں کے لئے ڈاک خرچ بذمہ ادارہ
آپ ہمیں ڈھائی سو روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال فرمائیں اور گھر بیٹھے کتاب حاصل کریں۔

ملی ٹائمز پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

January, 1999
Vol.: VI No.: 1

The Milli Times International

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-25 Fax: +91-11-6946686
Tel.: +91-11-6827018, 6926246 Email: militime@del3.vsnl.net.in

Rs. 8/-
RNI #57337/94

کوسوو کے بے بس خانمابرباد مسلمان پڑوس کی ریاستوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ البانیہ کے سرحدی علاقے لٹے پٹے مہاجر قافلوں کی آماجگاہ بنتے جارہے ہیں۔ دارالحکومت پرسٹینا میں خوفناک مایوسی اور دل گرفتہ خاموشی کا سایہ گہرا ہوتا جارہا ہے۔ شاید ہی کوئی دن ہو جب مسلمانوں پر ہونے والے تازہ بہ تازہ حادثات کی خبروں کا سلسلہ رک جاتا ہو۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں برف کچھ اس طرح جمتی ہے جیسے وہ فطرت کے مرغزار نہ ہوں بلکہ جدید تہذیب کے دل ہوں منجمد، بے حس، زندگی سے خالی۔ نہ جانے کتنے لوگ اس ٹھنڈک کی تاب نہ لاکر عدم کو سدھار گئے باقی جو بچ رہے اب انھیں بے بسی کا عذاب سہنا ہے۔ اوپر کھلا آسمان جہاں سے وقفے وقفے سے ژولہ باری ہوتی رہتی ہے، نیچے اجنبی زمین جو ہر لمحہ ان بے بس مسلمانوں پر تنگ ہوتی جارہی ہے۔

البانیہ میں مسلم خواتین کا یہ جلوس جسے مظاہرہ امن کا نام دیا گیا ہے ان ہزاروں بے خانماں مسلم گھروں کی چیخ وپکار ہے جن کے مرد سربوں کے ہاتھوں قتل کردئے گئے۔ بہتوں کو اس بات کا پتہ بھی نہیں کہ اس کا شوہر اب کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اور کیا پتہ اگر وہ سربوں کی جیل میں اذیت کے دن گن رہا ہو تو عجب نہیں کل کسی لمحہ اس کی واپسی بھی ممکن ہوجائے موہوم امیدوں کے سہارے ان مسلم بہنوں نے اپنی زندگی کا چراغ جلائے رکھا ہے۔

ہر رات اس امید میں کٹتی ہے کہ شاید آنے والی صبح کوئی اچھی خبر لائے۔ یوروپی سیاست دانوں کی منافقت اور ناٹو کی بے ضرر دھمکیوں سے یہ لوگ خوب واقف ہیں لیکن نہ جانے کیوں ان کا جی چاہتا ہے کہ ان جھوٹے وعدوں پر بار بار یقین کرلیں۔ ٹیلی ویژن کے پردوں پر انسانی حقوق کے علمبردار اور بحالی امن کی رضاکار تنظیموں کی کارگزاریوں کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا ہے اور وہیں گاہے بگاہے عالمی مسلم تنظیموں کی طرف سے ہمدردی کا اظہار بھی ہوتا ہے لیکن کسی گوشے سے کسی عملی اقدام کی خبر نہیں آتی۔ ان بے بسوں کی مدد کے لئے کسی جانب سے کوئی کمک نہیں پہنچتی۔ آسمان سے ریڈکراس کے جہاز کبھی کبھی ذلت کی روٹیوں کے پیکٹ ضرور پھینکتے ہیں لیکن اللہ کی طرف سے فرشتوں کا نزول نہیں ہوتا۔ ان میں سے کم ہی ہیں جن کی نگاہیں امدادی جہازوں کے بجائے اللہ کی مدد کی منتظر ہوں، ہاں گاہے بگاہے ان بے چاریوں کے دلوں میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے ہے اور یہ کہ ہماری امت کے لوگ بلقان میں کمزور ضرور ہوں دنیا کے دوسرے حصوں میں انھیں قوت وسطوت حاصل ہے۔ چند سال پہلے تک ان مصیبت زدہ خواتین کو اس بات کا شعور بھی نہ تھا کہ ان سے تعلق رکھنے والے لوگ بلقان سے باہر بھی آباد ہیں لیکن جب بوسنیا کی جنگ میں دنیا بھر سے مسلم نوجوان اور بہنیں شریک ہونے لگیں تو انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ عددی اعتبار سے دنیا کی پچیس فیصد آبادی کا حصہ ہیں، جس کا عقیدہ ہے کہ وہ سب آپس میں ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک حصے میں اگر تکلیف ہو تو دوسرا حصہ اسے محسوس کرتا ہے۔ تبھی انھیں یہ بھی پتہ لگا کہ اس وقت پچاس سے زائد ممالک پر ان کی امت کے لوگ حکمراں ہیں اور یہ کہ تیل کی بیش بہا دولت کا بڑا ذخیرہ بھی اسی امت کے قدموں میں بہتا ہے۔ امید تھی شاید بوسنیا کی طرح کوسووئیں بھی کوئی معجزہ رونما ہو لیکن اس انتظار اور محض انتظار نے جو کچھ دیا ہے وہ لٹے پٹے قافلوں کے نہ ختم ہونے کا سلسلہ ہے جہاں پر امن احتجاج میں امن کا نعرہ لگانے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، مغرب کے کفار ومشرکین بڑی دلچسپی سے اس تماشے کو دیکھتے ہیں۔ انھیں حیرت ہوتی ہے کہ کل تک جو لوگ خود کو قیام امن کا علمبردار سمجھتے تھے آج وہ ہم سے قیام امن کا مطالبہ کررہے ہیں۔

مدد نہ آسمان سے آتی ہے اور نہ ہی اس وقت اس امت کی مجبور بیٹیوں کی غم خواری کے لئے مسلمانوں کا کوئی نگہباں موجود ہے۔ وہ لوگ اب اٹھ گئے جو کبھی یوروپ کے دروازوں پر دستک دیتے تھے۔ رہی آسمانی مدد کی بات تو یہ اسی وقت آسکتی ہے جب بہنوں کے اس جلوس کو آسمانی ایجنڈے کا شعور بھی ہو اور انھیں یہ معلوم ہو کہ مسلمان اس دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں امن کا مطالبہ کرنے کے لئے نہیں۔ امن کا مطالبہ تو ہاری ہوئی قوموں کا شیوہ ہوتا ہے جو ہر قیمت پر صرف زندہ رہنا چاہتی ہے۔ مسلمان اگر دشمن سے امن کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ موجودہ ذلت کی زندگی کے خوگر ہوگئے ہیں۔ وہ دشمن سے اتنے خائف ہیں کہ اس کے ظلم وجبر ختم کرنے اور ناانصافیوں کے خاتمے کے لئے اب ان کے پاس حوصلہ نہیں رہ گیا ہے اور جب حوصلے جواب دے جائیں اور دنیا کو ناانصافیوں سے پاک کرنے کا ایجنڈا کھو جائے تو پھر اللہ کی مدد کے آنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ پھر اگر آسمانوں سے کچھ اتر سکتا ہے تو وہ ریڈکراس کے جہازوں سے پھینکے گئے ذلت کی روٹی کے چند ٹکڑے اور بس۔

اے کاش کہ ہم جان پاتے کہ ہم جس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ مطالبہ امن نہیں بلکہ قیام امن ہے۔ ▭